ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

ستمبر ۲۰۲۰ء | جلد ۱۱ | شمارہ ۱۲ | محرم الحرام ۱۴۴۲ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد انصاری 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ: 25:00 روپے
سالانہ: 250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ: 500:00 روپے
بیرونی ممالک: 30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال): 4000:00 روپے

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

خط و کتابت کا پتہ:

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر ڈی، کوارسی بائی پاس، علی گڑھ
e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Designed and composed by Abdullah Maroofi, Mob. 8218439622; email-almarufi.abdullah369@gmail.com

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱-	قرآن کا پیغام		محمد عارف ندوی
۲-	اداریہ	فکری زاویے ملک کی نئی تعلیمی پالیسی اس معاشقہ کا پردہ بھی فاش ہوگیا یومِ آزادی اور احتساب	مدیر ۳
۳-	مطالعۂ قرآن	کامیابی کی قرآنی علامتیں	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ۱۱
۴-	// //	ذکر الٰہی کے فیوض و برکات	ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی ۱۶
۵-	احوالِ وطن	ہندوستان کی قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰	ڈاکٹر فہیم اختر ندوی ۲۷
۶-	اسلامی تعلیمات	ایک نیا مشرکانہ نعرہ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ۳۴
۷-	نقطۂ نظر	سیکولرازم اور اسلام	محمد نفیس خان ندوی ۳۸
۸-	بحث و نظر	امام ابوحنیفہ-مسلکی اصول اور حدیث	مولانا محمد فرید حبیب ندوی ۴۰
۹-	تعلیم و تربیت	سزا	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ۴۸
۱۰-	تاثرات	اسلام کا بیٹا: ضیاء الرحمٰن	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی ۵۳
۱۱-	گوشۂ ادب	ماہر القادری کی نعتیہ شاعری کا منفرد بیانیہ	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ۵۶
۱۲-	ذکر آزادی	آزادی کا ۷۴واں سال	شکیل رشید ۶۱
۱۳-	شعر و ادب	ترا مقام تو ہے بوذریؓ و کراریؓ	ماہر القادریؒ

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

فکری زاویے

نوٹ: حکومت نے نئی تعلیمی پالیسی کا تفصیلی مسودہ عام نہ کرکے ایک مختصر وملخص مسودہ عام کیا ہے، جس کو سمجھنے میں اکثر لوگ الجھے رہیں گے، ماہرین کے مطابق تفصیلی مسودہ میں وہ بہت کچھ ہے جو اس میں نظر نہیں آتا، آر ایس ایس کی تقریباً ۶۰ رفیصد آرا تسلیم کرلی گئی ہیں، خیال تھا کہ اس پر بھرپور لکھیں، مگر صرف اشاروں پر اکتفا کررہے ہیں کیونکہ ڈاکٹر فہیم اختر ندوی صاحب کا ایک بھرپور اور مفصل مضمون اسی موضوع پر آگیا ہے جس میں تقریباً وہ مواد ہے جو ہم پیش کرسکتے یا پیش کرنا چاہتے تھے۔ (مدیر)

ملک کی نئی تعلیمی پالیسی:

وطن عزیز میں اس وقت حکمرانی کرنے والی جماعت کا اپنا ایک نظریہ ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کو بہت تیزی کے ساتھ نافذ کردینے کے لیے بے تاب ہے، اس کے پے بہ پے مسلسل اقدامات یہ بتارہے ہیں کہ وہ ملک کو برہمنی نظام کی طرف لے جانا چاہتی ہے، اس نئے نظام میں برہمنیت کی بالادستی ہوگی، بقیہ سب دوسرے درجہ کے شہری ہوں گے، جاگیردارانہ نظام ہوگا مگر اس کی شکل بدلی ہوئی ہوگی، کشمیر سے 370 کا ہٹایا جانا، CAA اور NRC سب اسی کا پیش خیمہ ہے، سب سے زیادہ خطرے کی بات یہ ہے کہ مختلف حیلوں سے اپوزیشن پارٹیوں کو بالکل کمزور بلکہ ختم کردیا گیا ہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی نئی تعلیمی پالیسی ہے، جو کابینہ سے پاس ہوچکی ہے، جس میں دیگر افراد واداروں کی آرا کو وہ جگہ نہیں دی گئی ہے جو آر ایس ایس کی آرا کو دی گئی ہے، آر ایس ایس کی تقریباً ۶۰ رفیصد آرا کو قبول کیا گیا ہے، یہ بھی حکومتی عیاری ہے کہ کووڈ ۱۹ کے اس کسمپرسی کے دور میں اس کا مسودہ عام کیا گیا ہے، اس میں بھی یہ چالاکی کی گئی ہے کہ تفصیلی مسودہ کے بجائے اشارات پر مشتمل ایک ملخص مسودہ عام کیا گیا ہے۔

تجزیہ نگاروں نے اس کا تجزیہ کیا ہے اور کررہے ہیں، ہر ذی شعور کو اسے پڑھنا چاہیے، اس پر لکھنا چاہیے، حکومت نے اگرچہ اس کو کرونا کے دور میں متعارف کرایا ہے لیکن کرونا کے بعد اس سے نمٹنے کے لیے تیار رہنا چاہیے، اس تعلیمی پالیسی کی سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ اس کے سب عناوین بہت پرکشش ہیں لیکن اندرون میں خطرناک منصوبہ بندی ہے، اس پالیسی کے نفاذ سے تعلیم کا بھی تقریباً پرائیوٹائزیشن ہوجائے گا، جیسے کہ رفتہ رفتہ تمام اداروں کو فروخت کیا جارہا ہے، بینکوں کے دن بہ دن بدلتے قوانین اور پرائیویٹائزیشن کی بڑھتی رفتار سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اب دولت ووسائل کو ایک طبقہ میں محدود کرنے کی منصوبہ بندی ہے، نئے جاگیردارانہ نظام کی یہی شکل ہوگی، اس کے نفاذ کے نتیجہ میں آئندہ چند سالوں میں غریب چھوڑیے، متوسط طبقہ کے لیے حصول تعلیم

مشکل نہیں ناممکن ہوجائے گی، اس طرح ملک کے امیر ترین لوگوں کے درمیان تعلیم محدود ہوکر رہ جائے گی، حکومت نے اس پالیسی میں سرمایہ کاری پر بہت زور دیا ہے اور مالی فراہمی سے اپنا دامن بالکل جھاڑ لیا ہے۔

رزرویشن اور اسکالرشپ اس کے نفاذ سے تقریباً ختم ہوجائے گی جس کا سب سے زیادہ نقصان درج فہرست برادریوں کو ہوگا، اب ظاہر ہے کہ جب تعلیم کے مواقع نہیں ہوں گے تو پھر روزگار انھیں کیسے ملے گا، گویا اس طرح تمام پچھڑے اور غریب لوگ ملک میں نمبر دو کے شہری ہوکر رہ جائیں گے۔

طُرفہ تماشا یہ ہے کہ پالیسی میں دستور کے مطابق کئی جگہ سائنسی ذہن پیدا کرنے اور ملک کو سائنسی ترقی کی راہ پر ڈالنے کی بات کہی گئی ہے، مگر تفصیلی مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ پالیسی اس دعوے کے خلاف ہے، دیومالائی کہانیاں اور تاریخ کے اوراق میں دفن ہوچکی مذہبی اصطلاحات کی تدریس سے کہیں یہ ممکن ہے کہ سائنسی ذہن پیدا ہوسکے، طلبہ کو طلبہ پڑھائیں گے، رضا کاروں کی مدد لی جائے گی، دسویں جماعت کے فارغ اساتذہ بھی آنگن واڑی کی تین سالہ تعلیم کے لیے مہیا ہوں گے، بہت سے اسکولوں کا ایک بلاک بنادیا جائے گا، وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے، ایک دوسرے کے وسائل سے فائدہ اٹھائیں گے، سوچئے ذرا اس طرح لوٹ کھسوٹ اور الجھنوں میں اضافہ ہوگا یا پھر سائنسی ترقی ہوگی۔

اس پالیسی کا خطرناک ترین پہلو یہ ہے کہ پورے ملک میں تعلیم کے ذریعہ ایک فکر، ایک کلچر اور ایک ثقافت کو فروغ دیا جائے، اس کے لیے دیومالائی چیزیں داخل نصاب ہوں گی، جبکہ سیکولرزم کے تصور کو تو نصاب سے رفتہ رفتہ یوں ہی خارج کردیا گیا ہے، اساتذہ کی تقرری کے لیے ایک بورڈ ہوگا، بظاہر ایسا شفافیت کے لیے کیا گیا ہے لیکن درحقیقت یہ بورڈ اسی خاص فکر کو پرموٹ کرنے والے اساتذہ کی تقرری کرے گا، ریسرچ کے لیے بھی ایک ادارہ بنایا جائے گا جس کی منظوری کے بغیر ریسرچ نہیں ہوگی، اب ظاہر ہے کہ وہ کیسی ریسرچ کو فروغ دے گا یہ اس پر منحصر ہوگا، وزارت تعلیم نہیں بلکہ ایک کمیٹی براہ راست نگرانی کرے گی جس کے سرپرست وزیر اعظم ہوں گے، اس پالیسی کے لحاظ سے اداروں کے اختیارات تقریباً سلب کرلیے گئے ہیں، سب کو سرکار کی پالیسی اور سرکار کی سوچ کے تابع بنادیا گیا ہے، اس کے نفاذ کے بعد اداروں میں ایک ہی فکر کے منتظم اور ایک ہی فکر کے اساتذہ ہوں گے اور وہ اسی فکر کو فروغ دیں گے، جب ایک ہی فکر اور ایک ہی سنسکرتی پورے ملک میں نافذ کرنی ہے تو ظاہر ہے کہ آزاد اور اقلیتی تعلیمی ادارے راہ کا روڑا بنیں گے، لازمی طور پر پھر دستور میں دی گئی آزادی میں ترمیم ہوگی جواب اس حکومت کے لیے محض ایک کھلواڑ ہے، بہت سے وہ کام جو بہت پہلے کرنے کے تھے مگر اپنی ضد اور ناعاقبت اندیشی سے نہیں کیے گئے اور اب بھی ہم کرنے کے لیے تیار نہیں تو بالآخر نتیجہ تو بھگتنا ہی پڑے گا۔ (لا قدر الله)

جہاں تک اردو اور عربی کا تعلق ہے تو اسے پورے طور پر نظر انداز کیا گیا ہے، ہندوستانی زبانوں کی بات تو کی گئی ہے مگر پالیسی ساز ان دونوں کو ہندوستانی زبان مانتے کب ہیں، ہندی کو لازمی قرار دینے کے ساتھ مادری زبان اور انگریزی زبان میں تعلیم کی بات کی گئی ہے، سوال یہ ہے کہ کون سی ریاست ہے جس میں مادری زبان اردو قرار پائے گی، اس طرح رفتہ رفتہ اردو کو نصاب ونظام تعلیم سے خارج کرنے کی پوری تیاری ہے، اب تو رفتہ رفتہ رازوں سے پردے اٹھ رہے ہیں، آج ہی یشونت سنہا کا ایک ٹوئیٹ دیکھا جس میں اس نے مودی کو مبارکباد دی ہے یہ کہتے ہوئے کہ نئی تعلیمی پالیسی اردو کو ہندوستانی زبان نہیں شمار کرتی ہے، سبرانیم سوامی نے اپنے ٹوئیٹر ہینڈل سے واضح طور پر لکھا ہے کہ ہندتوا کے لیے اصل لڑائی ۱۶ رمئی ۲۰۱۴ء کو شروع ہوئی، اب ظاہر ہے کہ جو کچھ پردے میں تھا وہ سب آہستہ آہستہ باہر آرہا ہے۔ اردو کے لیے ہماری تڑپ بجا ہے، بے شک ہمارا تہذیبی و مذہبی سرمایہ اردو میں ہے مگر کاش ہم نے اپنے

سارے لٹریچر کو ہندی اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں منتقل کر دیا ہوتا تو آج یہ اردو کو مسلمان سمجھنے والے اپنا سر پیٹ رہے ہوتے۔

قصہ مختصر یہ کہ یہ تعلیمی پالیسی اس کے باوصف کہ اس میں کئی ایک اصلاحات اور پر کشش عناوین موجود ہیں، پورے طور پر بھارت کے مزاج ومذاق اور اس کی رنگارنگی کے خلاف ہے، سائنسی عہد اور سائنسی فکر کے خلاف ہے، اس کا مقصد صرف اور صرف منووادیا برہمن واد کو رفتہ رفتہ فروغ دینا ہے، تعلیم کو امیروں کی حد تک محدود کر دینا ہے، بھارت کی بڑی آبادی کو محروم ومعذور بنا دینا ہے، یہاں بسنے والی اقوام کو ایک دوسرے سے بہت دور کر دینا ہے، اس کی زد جتنی مسلمانوں پر پڑنے والی ہے اس سے کہیں زیادہ درج فہرست برادریوں یعنی بھارت کی آبادی کے سب سے بڑے حصے پر پڑنے والی ہے، ہم نے یہاں صرف اشارے کیے ہیں، مسلمانوں کو اس کا تفصیلی جائزہ لینا چاہیے، تکنیکی طور پر اس کے جھول عالمی پیمانے پر بیان کرنا چاہیے اور اس کے نفاذ کا راستہ روکنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے مگر قطعی طور پر اس کو صرف اپنا مسئلہ بنا کر پیش کرنے کی غلطی سے بچنا ضروری ہے، کہیں یہ بھی ہندو مسلم کارڈ کی شکل اختیار نہ کر جائے، البتہ جب دوسرے لوگ اس مسئلہ کو لے کر اٹھیں تو ان کا بھرپور تعاون کرنا چاہیے، بلکہ اس کی کوششیں تیز کر دینا چاہیے کہ دوسرے اس مسئلہ کو اٹھائیں، بھارت میں ابھی سب کا ذہن نہیں بگڑا ہے اگرچہ اس کی پوری کوشش ہو رہی ہے، کئی غیر مسلموں نے اس پر تکنیکی طور سے بھرپور تنقید کی ہے، تمل ناڈو اور کیرلا وغیرہ میں تو اس کی کاپیاں جلانے کی بھی خبریں ہیں، ویسے بھی وہاں ہندی کی لازمیت کی ضد ایک خطرناک صورت اختیار کر سکتی ہے۔

اس معاشقہ کا پردہ بھی فاش ہو گیا:

امت کی تاریخ میں پستی وذلت اور بے بسی وخیانت کا یہ منظر بھی دیکھنا مقدر ہوگا ایسا کبھی سوچا بھی نہ تھا، واقعہ یہ ہے کہ متحدہ عرب امارات نے فلسطین کے غاصب اور مسلمانوں کے سب سے بدترین دشمن سے معاہدہ امن کر کے فلسطینی شہیدوں کے ساتھ ایک ایسی بدترین تاریخی خیانت کی ہے جس کی مثال امت کی تاریخ میں نہیں ملتی، اگر اس بدترین خیانت پر کوئی چپ رہتا ہے یا اپنی مصلحتوں کے تقاضے سے چپ رہنے کی تلقین کرتا ہے تو شاید وہ عنداللہ مواخذہ سے بچ نہ سکے۔

جمعرات ۱۳/اگست کو جب یہ خبر آئی کہ امریکی صدر کی ثالثی سے امارات واسرائیل کے مابین اب معاہدہ امن ہو گیا ہے، اب مکمل سفارتی تعلقات ہوں گے، مختلف شعبوں میں مثلاً طب وصحت، صنعت وتجارت اور امن وسلامتی میں باہمی تعاون ہوگا تو راقم کو بالکل بھی حیرت نہ ہوئی بلکہ یہ محسوس ہوا کہ ایک معاشقہ چل رہا تھا، چھپ چھپ کے ملاقاتیں ہو رہی تھیں اب نکاح کا اعلان ہو گیا، راقم کو اسرائیل کے ساتھ مل کر عربوں کی خطہ میں تخریبی کارروائیوں کا علم تھا، یہ بھی معلوم تھا کہ اماراتی ہی فلسطینیوں سے القدس میں زمینیں اور مکانات خرید کر یہود کے ہاتھوں فروخت کرتے ہیں اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ فلسطین واقصی کی آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی عرب ریاستیں ہیں۔

مصر واردن پہلے ہی اسرائیل کو تسلیم کر چکے ہیں، بحرین کے تعلقات بھی ڈھکے چھپے نہیں ہیں، بلکہ اس معاہدہ کے بعد سب سے پہلے مصر وبحرین نے مبارکبادیاں پیش کیں، امت کے باحمیت لوگوں نے اسے بدترین تاریخی خیانت قرار دیا، الاتحاد العالمی کے ذمہ داروں نے کہا کہ یہ فلسطینیوں کے ساتھ کھلا ہوا دھوکہ ہے، اس سے فلسطین کا قضیہ کمزور ہوگا، مفتی عمان کا جرأت مندانہ بیان سامنے آیا کہ مسجد اقصیٰ اور فلسطین کی آزادی اس امت پر واجب ہے، اگر کوئی اس واجب کو نہیں پورا کر سکتا تو اسے خاموش رہ کر اللہ سے دعا کرنی چاہیے، اللہ کا کوئی بندہ اٹھے گا اور اس ذمہ داری کو پورا کرے گا مگر کسی حال میں بھی کسی کو اس واجب کو کمزور کرنے والے کسی اقدام یا مسجد اقصیٰ کی سودے بازی کی اجازت نہیں دی جا سکتی، واقعہ یہ ہے کہ اس فیصلے سے قضیۂ فلسطین بہت کمزور ہو جائے گا، اس کے بعد عرب ومسلم ممالک میں اسرائیل کو تسلیم کرنے کا سلسلہ چل پڑے گا، پھر وہی اسرائیل بڑھتے بڑھتے اپنے منصوبہ کی تکمیل کرے گا، فکری وسیاسی وصنعتی برتری کے

ساتھ ان ہی عرب ریاستوں کے سر پر سوار ہو کر گریٹر اسرائیل کا خواب مکمل کرے گا، یہودی پروٹوکول کے مطابق یہودی ریاست اپنے سفارتی تعلقات میں پابند عہد نہیں رہ سکتی، مگر اگر دوسرے عہد کی خلاف ورزی کریں تو وہ سزا دے سکتی ہے، بلکہ یہودی ریاست اپنے طے شدہ منصوبہ کے مطابق اپنے سفارات کی راہ میں آنے والے تمام پڑوسی ممالک پر جنگ بھی مسلط کر سکتی ہے۔

ان عربوں نے دراصل خلافت عثمانیہ کی تقسیم میں معاونت کے بدلہ یہ جاگیریں پائی تھیں، پھر اللہ نے وسائل سے نوازا تو بھی غافل ہی رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر چیز کے لیے دوسروں کے محتاج بن کے رہ گئے حتی کہ اپنی حفاظت کے لیے بھی دوسروں کے دست نگر بن گئے، پھر دشمن نے تحفظ کی ضمانت دینے کے ساتھ ان کے وسائل پر قبضہ کیا اور ان کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا، جس فکر و نظام سے امریکہ و اسرائیل کو خطرہ ہوا اس کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے ان ہی عربوں کو اور ان کی دولت کو استعمال کیا، مصر میں ہم ان کی کارستانی دیکھ چکے ہیں، یمن و شام کو کھنڈر بنانے میں ان کا کردار گھناونا ہے، لیبیا میں ان کی گھناونی سازشیں جاری ہیں، مقصد صرف ایک ہے کہ اخوان یا اخوانی ذہن کے لوگ اقتدار تک نہ پہنچیں، بالآخر عاجز ہو کر ترکی نے کچھ دنوں قبل ایک سخت اور دھمکی آمیز بیان جاری کیا جس کے نتیجہ میں بیچارے ابال کھا کر اسرائیل کی چوکھٹ پر جا گرے چونکہ امارات کا ہر قدم سعودیہ کے اشارے پر ہوتا ہے اور ترکی کو کمزور کرنا اس کی راہ روکنا اولین مقصد ہوتا ہے، اس لیے کہ دونوں اپنی خارجی سیاست میں بالکل مختلف ہیں، ترکی نے عرب بہاریہ کا مکمل تعاون کیا اور سعودیہ و امارات نے اس کو ناکام کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی، اس طرح اصل اختلاف نظریاتی اور خارجی ہے اور خطہ میں نظام حکمرانی و بالادستی سے متعلق ہے، ورنہ تجارتی معاملات دیکھیے تو اس پر بڑی حد تک سیاست کا اثر نظر نہیں آتا وہ قطر و سعودیہ سے کچھ یکساں ہی معلوم ہوتے ہیں، مصر میں ملعون زمانہ سیسی کو مسلط کرنے کے لیے سعودیہ و امارات نے ہر ممکن اقدام کیا جبکہ ترکی منتخب حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے کوشاں تھا، پھر ترکی کے ۲۰۱۶ء کے ناکام فوجی انقلاب میں بھی اسرائیل و امریکہ کی منصوبہ بندی کے ساتھ سعودیہ و امارات کا نام سامنے آیا تھا، یہی رویہ امارات نے لیبیا و شام میں اپنا رکھا ہے چنانچہ چند دنوں قبل الجزیرہ سے گفتگو کرتے ہوئے ترک وزیر دفاع خلوصی آکار نے کہا کہ یوں بھی امارات کے اقدامات ترکی کے لیے مضرت رساں ہوتے ہیں، لیبیا اور شام میں جس طرح وہ ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے ہم مناسب وقت اور مناسب مقام پر اس سے حساب کریں گے، چونکہ یہ بیان وزیر دفاع کی طرف سے تھا اس لیے اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

اس معاہدہ کو امت کے غیور لوگوں نے عربوں کے لیے عار بتایا ہے، اس کے نقصانات و نتائج کے پیش نظر ترکی نے امارات سے اپنے سفارتی تعلقات موقوف کرنے کا بھی اعلان کر دیا ہے، اس نے صاف کہا ہے کہ فلسطین نہ کسی کو ہضم کرنے دیا ہے، نہ ہضم کرنے دیں گے، ترکی نے یہ سخت موقف اس لیے اختیار کیا کیونکہ سعودیہ و امارات مسلسل ترکی کے خلاف اقدام کر رہے ہیں، ۲۰۱۶ء کی فوجی بغاوت سے لے کر اردوغان کے الیکشن میں ان کی شکست کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا، دولت اور میڈیا کا بدترین استعمال کرنا، سنچری ڈیل پر ترکی کا سخت موقف اختیار کرنا اور ان کی طرف سے اس کے موقف کو کمزور کرنے کی کوشش کرنا، ترکی میں یورش کی کوششیں کرنا اور حکومت مخالف لوگوں کو مدد دینا، شام و لیبیا اور یمن میں اس کو الجھانے کی کوشش کرنے تک مسلسل یہ لوگ ایک ابھرتی ہوئی مسلم طاقت کو کمزور کرنے کے درپے ہیں، اس کے پیچھے سعودیہ کا کردار سب سے زیادہ داغدار ہے جس نے ترکی میں موجود اپنی ایمبیسی میں اپنے ہی شہری کو موت کے گھاٹ اتارا، امارات کی طرف سے اٹھایا جانے والا ہر قدم سعودیہ کا اشارہ ہوتا ہے، خطہ میں اپنی چودھراہٹ اور عالمی منظر نامہ پر مسلمانوں کا مسیحا بنے رہنے کے لیے یہ سارے گھناؤنے کام انجام دینے میں انھیں کوئی عار نہیں، یہی وجہ ہے کہ اردوغان نے ان کے خلاف سخت ترین موقف اختیار کیا، کیونکہ یہ لوگ کٹھ پتلی بن کر راہ کا روڑا بنے ہوئے ہیں، ان کے منہ

میں ان کی زبان ہے ہی نہیں، چونکہ ان بے حیثیت لوگوں کے واسطے سے امریکہ ترکی کو کمزور کرنا اور پیچھے ڈھکیلنا چاہتا ہے تو ترکی نے بھی اب بے حیثیت لوگوں کو ہی یکسر مسترد کرنے کی ٹھانی، ترکی کے مطابق امارات محض ایک ایسی ریاست ہے جو دوسروں کے ہاتھ میں کھیلتی ہے اور دوسروں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

یہاں سطحی ذہن کے لوگ سوال کر سکتے ہیں بلکہ کرتے ہیں کہ اردوغان یہ موقف اسرائیل کے خلاف بھی تو اپنا سکتا تھا؟ ان سے کاؤنٹر سوال کیا جاسکتا ہے کہ سعودیہ وامارات اگر قرآن کے مخالف جا کر یہود ونصاریٰ کو اپنے تحفظ کا ضامن بنا سکتے ہیں تو ابھرتی ہوئی عسکری واقتصادی طاقت کے ساتھ مل کر ایک مضبوط بلاک کیوں نہیں تیار کر سکتے؟ خیر ایسے سطحی لوگ یہ سب کہاں سوچیں گے، البتہ ایسے لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ ترکی کا حکمراں مملکت توحید کا بادشاہ نہیں، ایک لادین سیکولر ملک کا منتخب صدر ہے، جسکی حیثیت ہنوز ۳۲ دانتوں کے درمیان تنہا زبان کی ہے، اس میں بھی اپنوں کے دانت زیادہ دھاردار ہیں اور غیر تو دانت پھاڑے کھڑے ہی ہیں، آج بھی وہاں سیکولرزم کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ تمام تر ثبوت وشواہد واختیارات کے باوجود اسے ایاصوفیا کو دوبارہ آباد کرنے میں اتنی طویل مدت لگ گئی، اسرائیل سے تعلقات اردوغان کو وراثت میں ملے، اس میں ایک تلخی تب آئی جب ڈیووس کانفرنس میں ایریل شیرون کو ڈانٹ کر اردوغان کانفرنس چھوڑ کے باہر آ گئے، دوسری تلخی تب آئی جب انھوں نے حماس کے گرفتار پارلیمانی ممبران کی حمایت میں سخت موقف اختیار کیا، یہ تعلقات اسٹراٹیجک شراکت داری پر مشتمل تھے، رفتہ رفتہ موجودہ حکمران انھیں برابری کی سطح تک لائے اور تعلقات کو رسمی حیثیت تک باقی رکھا، یک لخت اسرائیل سے تعلقات ختم کرنا ترکی کے لیے ہنوز ممکن نہیں، یہ کہنے والے کے لیے تو بہت آسان ہے مگر کرنے والے کے سامنے ہزار مسائل ہیں، اس کی اندرونی سیاست اور اس میں موجود لادینی عناصر، یورپین یونین، نیٹو کی رکنیت اور بے شمار مجبوریاں ہیں جن کے سبب متعدد بار تلخیوں کے باوجود یہ تعلقات انقطاع پر منتج نہ ہو سکے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان رسمی تعلقات کے باوجود موجودہ ترکی نے کبھی بھی فلسطین کے قضیہ میں لچکدار موقف نہیں اختیار کیا، حالیہ اقدامات یہ کہہ رہے ہیں کہ بہت جلد وہ دن بھی آئے گا جب مکمل انقطاع ہوگا، ترکی اسرائیل تعلقات کی بقا کا ایک بڑا سبب عربوں کے خفیہ تعلقات بھی ہیں جو اب ظاہر ہو رہے ہیں، اگر سعودیہ وامارات نے مصر وشام کے انقلاب کو کامیاب ہونے دیا ہوتا تو نہ صرف یہ تعلقات بھی منقطع ہو چکے ہوتے بلکہ منظر نامہ ہی کچھ اور ہوتا، تجزیہ کرتے ہوئے صرف ایک پہلو یا محض فکری ومسلکی ہم آہنگی ہی پیش نظر نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر پہلو سے جائزہ لینا چاہیے، ہمارے لیے مہبط وحی اور مرکز اسلام اور وہاں کے لوگوں سے زیادہ محبوب کون ہو سکتا ہے، ہمیں نہ ان سے دشمنی ہے اور نہ ترکی سے دوستی، بات تو صرف یہ ہے کہ کون اسلام اور مسلمانوں کے وسیع تر مفاد میں اقدام کر رہا ہے اور کون ملمع سازی کے ساتھ اغیار کا دست وبازو بنا ہوا ہے، ہمارے سلفی بھائی اندھا دھند عرب نوازی میں مبتلا ہیں، حتی کہ اب اسرائیل یعنی غاصب وظالم سے دوستی کے لیے بھی قرآن وسنت کا استعمال شروع کر دیا، مفتی امارات کا تائیدی بیان دیکھ کر شاہ صاحبؒ کی وہ بات ذہن میں آئی کہ اگر اس زمانے میں عملی نفاق کے مظاہر دیکھنے ہیں تو امراء ان کے ہم نشیں اور ان کے حاشیہ برداروں کی مجلس میں بیٹھے اور دیکھیے کہ وہ کس طرح رضائے حاکم کو رضائے الٰہی پر ترجیح دیتے ہیں، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ براہِ راست نبی سے حدیث سن کر منافقت کرنے والوں اور آج کے ان لوگوں میں قطعی کوئی فرق نہیں ہے جن تک احکام شریعت قطعی ویقینی ذرائع سے پہنچے، دوسری طرف اسی طرح کل ایک معروف اور بڑے دیوبندی عالم کا آڈیو سنا تو حیرت کی انتہا نہ رہی، انھوں نے شاید کسی کو اس سوال کا جواب دیا ہے کہ اردوغان بریلوی مکتب فکر سے زیادہ قریب ہے، یا دیوبندی مکتب فکر سے، اس ضمن میں انھوں نے سلاسل تصوف اور تعارف دارالعلوم وغیرہ ذکر کر کے یہ ثابت کر دیا کہ بظاہر عقائد وافکار میں ہم سے قریب تر ہیں، میں سوچنے لگا کہ جب حق وباطل برسر پیکار ہیں، مشرق وسطی تقریباً ایک اور جنگ عظیم کا اسٹیج بننے کو ہے، ملت کے انگ انگ سے خون رس رہا ہے، اس وقت بھی ہمارے لوگ اپنے خول سے باہر نکل کر

نہیں سوچ رہے ہیں، ایک مسلمان کے بجائے مسلک ومکتب فکر کے رکن کی حیثیت سے سوچنے کے بھیانک نتائج دیکھنے کے بعد بھی ہوش نہ آسکا ہے۔

اس معاہدہ سے بظاہر مغربی کنارے کو اسرائیل ضم نہیں کرے گا لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف ایک تھپکی اور میٹھی گولی کے سوا کچھ نہیں، اگر اس کی جگہ یہ بات ہوتی کہ اسرائیل ۱۹۶۷ء سے قبل کے حدود میں واپس جائے گا تو شاید آنسو پوچھنے کا کچھ سامان ہوجاتا، ورنہ تو فی الحقیقت یہ معاہدہ صدی ڈیل کی تکمیل کے لیے ہے، اب دیگر خلیجی ممالک بھی علانیہ سفارتی تعلقات قائم کریں گے، سب سے آخر میں سعودیہ کرے گا، یہ الگ بات ہے کہ موجودہ سعودی حکمراں کے سب سے گہرے تعلقات ہیں لیکن اسے قانونی شکل دینا باقی ہے، بہت ممکن ہے کہ سعودیہ پاکستان پر دباؤ بنا کر اسے بھی راضی کرلے، سعودی پاکستان تعلقات میں کشیدگی کی خبریں تو آرہی ہیں، ایک خبر یہ بھی نظر سے گذری کہ سعودیہ نے تیل کی سپلائی روک دی ہے، پاکستان کے آرمی چیف دورہ کرنے والے ہیں، ممکن ہے کہ یہ سب اسی تگ ودو کی ابتدا ہو جس کا راز بعد میں کھلے، یوں بھی سعودیہ کی ناراضگی بجا ہے کیونکہ پاکستان ترکی تعلقات دن بہ دن مضبوط ہورہے ہیں، کئی شعبوں میں باہمی تعاون اور سرمایہ کاری کا ترکی نے معاہدہ کیا ہے، سعودیہ کب چاہے گا کہ پاکستان ایٹمی طاقت ہوکر بھی اپنے پیروں کھڑا ہو اور اس کے تلوے چاٹنا بند کرے، بہرحال اس معاہدہ کا راست اثر پوری دنیا کے مسلمانوں بشمول بھارتی مسلمانوں اور بالخصوص فلسطینیوں پر پڑنا طے ہے، دیر سویر آپ یہاں بھی اس کے مظاہر دیکھیں گے اور اگر سعودیہ بھی رسمی تعلقات کا اعلان کرتا ہے تو یہاں کی خارجہ پالیسی سے زیادہ داخلی پالیسی میں تبدیلی آئے گی، پھر جو کچھ ہوگا وہ ناقابل بیان ہے، صرف عربوں کے معاشقہ اور نرم پالیسی کے سبب یہاں کی خارجہ پالیسی میں جو تبدیلیاں آئیں ان پر ہم پہلے روشنی ڈال چکے ہیں۔

بہرحال یہ بات تقریباً طے ہوچکی ہے کہ دنیا اب دو بلاک میں تقسیم ہونے والی ہے، ایک طرف ظالم وغاصب اور وسائل سے مالا مال اس کے حمایتی ہوں گے دوسری طرف ظالموں کے حریف اور کچھ مظلوم اور مظلوموں کے حمایتی ہوں گے، ایک طرف حق وانصاف کا دعوی ہوگا اور دوسری طرف حق وانصاف کو دنیا سے ختم کرنے والے، حق وناحق کی لڑائی میں اب منافقوں کے رخ سے نقاب سرکنے لگی ہے اور یہ تو ہونا ہی تھا کیونکہ منافق کا چہرہ ایک نہ ایک دن سامنے آہی جاتا ہے، جب مصیبت وآزمائش سامنے نظر آتی ہے تو نفاق چھپ نہیں پاتا، پہلے ہی مرحلہ میں ظاہر ہوجاتا ہے، یہی ہورہا ہے کہ اب پوری دنیا میں دو ہی موقف ہیں صحیح یا غلط، نفاق کے لیے گویا کوئی جگہ بچی ہی نہیں، قصہ مختصر یہ کہ مشرق وسطی تقریباً بارود کے ڈھیر پر پہنچ چکا ہے، لگتا ہے کہ پیشین گوئیاں صحیح ثابت ہونے کو ہیں اور مشرق وسطی جنگ کا میدان بننے کو ہے، (لاقدر اللہ) مگر ایسا اگر ہوا تو اس کی ذمہ داری خود عربوں پر ہوگی کسی اور پر نہیں۔

پوری دنیا کے مسلمانوں کو اس موقع پر ایسا متحدہ موقف اختیار کرنا چاہیے جس سے فلسطین کے لیے ان کی سنجیدگی وحمایت کا بھرپور اظہار ہو، قضیہ فلسطین کے سلسلہ میں ادنیٰ ترین سمجھوتہ ہمارے ہاتھوں سے ہمارے مقدسات چھین لے گا، اس معاہدہ میں موجود یہ بات انتہائی خطرناک ہے کہ پرامن مسلمانوں کے لیے مسجد اقصیٰ کے دروازے کھلے رہیں گے، یہ ایک طرح کی سودے بازی ہے، فلسطینی جیالوں پر مسجد اقصیٰ کے دروازے بند کرنے کی سازش ہے، یہ کون طے کرے گا اور کیوں طے کرے گا کہ پرامن کون ہے اور کون نہیں؟ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ شہر القدس سرخ لکیر ہے جو اسے عبور کرگیا وہ پوری امت اسلامیہ کی گردن دبوچ لینے میں کامیاب ہوگا، رہی سہی آزادی وعزت بھی اس کی مرہونِ منت ہوکر رہ جائے گی، اس لیے تمام مصالح ومفادات کو بالائے طاق رکھ کر یہ طے کیجئے کہ ہم کسی بھی ایسے اقدام کی تائید نہیں کریں گے جو فلسطین کے قضیہ کو کمزور کرنے کا سبب بنے، خواہ وہ اقدام کرنے والا دنیا کا کوئی برگزیدہ ترین شخص ہی کیوں نہ ہو۔

یومِ آزادی اور احتساب:

ہر سال یوم آزادی آتا ہے اور چلا جاتا ہے، ملک میں دھوم دھام سے جشن منایا جاتا ہے، عین اس وقت جب شہنائیاں بج رہی

ہوتی ہیں تو باشعور لوگوں کے سینوں میں ماتم بپا ہوتا ہے، جب لال قلعہ کی فصیل سے وعدوں کی بوچھار اور اعلانات کی بھرمار کے ساتھ جھوٹ کی برسات ہو رہی ہوتی ہے تو ہمارے اندر صحرا میں بھٹکتے پیاسے کی سی تڑپ پیدا ہوتی ہے، سماجی بے بسی ومحرومی کا احساس جاگتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے امیر ترین لوگوں کے درمیان کوئی غریب آدمی بس گیا ہو۔

عام طور پر من حیث القوم ہماری یہ عادت بن گئی ہے بالخصوص مذہبی طبقہ میں یہ رویّہ عام ہے کہ ہم اس موقع پر جب بھی بات کرتے ہیں تو بس یہ کہ آزادی بس مسلمانوں کا کیا کردار رہا؟ علماء نے کیا کردار ادا کیا؟ فلاں تنظیم کی کیا قربانیاں رہیں؟ طُرفہ یہ کہ ایسی گفتگو بھی سال میں ایک ہی مرتبہ ہوتی ہے اور ایک ہی زبان میں ہوتی ہے، یہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ سلسلہ سال بھر چلے اور کچھ اس طرح چلے کہ کم از کم ہر زبان بولنے والے ہماری تاریخ اور ہماری ثقافت سے تو واقف ہو ہی جائیں، اگر اس سے ذرا آگے بڑھتے ہیں تو تو اپنی محرومیوں اور سماجی ناانصافیوں کا ذکر کرتے ہیں؟ ذرا کچھ پڑھ لیا تو پھر تقسیم صحیح یا غیر صحیح کی بحث میں الجھ جاتے ہیں؟ حالانکہ اس موقع پر ہمیں اپنا احتساب کرنا چاہیے، ہمارے سامنے بحث وگفتگو کے لیے یہ سوالات ہونے چاہئیں کہ آخر جب سب سے زیادہ قربانیاں ہم نے دیں تو ہمارا ذکر تاریخ سے کیسے اور کیوں نکالا گیا؟ تقسیم سے جو نقصانات ہوئے ان کی بھرپائی کیسے ہو؟ آخر اب تک ہم محروم کیوں ہیں؟ اب تک ہم تعلیمی، سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے سب سے کمزور کیوں ہیں؟ ہم نے جس ملک سے محبت کی اور جس کے در ودیوار ہمیں محبوب تھے وہاں اب ہم اجنبی کیسے ہو گئے، جو ہمارے ماتحت رہے، وہ اب ہمیں پہچانتے کیوں نہیں؟ آخر ہماری کون سی پالیسیاں غلط تھیں؟ ان کا تدارک کیسے ہو؟ غلطی کہاں کہاں پر ہوئی؟ کیوں کہ جب تک غلطی کا ادراک نہیں ہوگا تب تک مستقبل کا درست خاکہ تیار نہ کیا جا سکے گا، جب تک ہم غلطیوں کا اعتراف نہیں کریں گے تب تک ہم صحیح راہ کا تعین نہ کر سکیں گے، بس یوں ہی اپنی وفاداری ثابت کرنے اور دفاع کرتے کرتے گزری ہے اور گزر جائے گی، لیکن آنے والی نسل کا اب دفاعی پالیسی سے بھی کام نہیں چلنے والا، یہ بھی ایک عجیب معاملہ ہے کہ جب جائزہ وتنقید کی بات کی جاتی ہے تو اسے بے ادبی وتنقیص سمجھ لیا جاتا ہے اور پھر اس طرح بات بے نتیجہ بلکہ بدمزگی پر ختم ہو جاتی ہے۔

مسلمان پہلے تقسیم وطن کا الزام دھوتے رہے، پھر فرقہ پرستی کا الزام دور کرنے میں لگے رہے، پھر دہشت گردی کے الزام پر اس کے دفاع میں اپنی کوششیں لگا دیں اور اب اس دہائی میں بالخصوص ۲۰۱۴ء کے بعد سے اپنی دیش بھکتی ثابت کرنے میں مقابلہ آرائی کرتے رہتے ہیں، جبکہ کچھ لوگوں نے یہ غلط روش پہلے سے ہی اختیار کر رکھی تھی، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مسلمان اقدامی پوزیشن میں آتے اور خود بڑھ کر سوال پوچھتے، ان کی قیادت نے جو عادت ڈال دی وہ جڑ پکڑتی چلی گئی، چنانچہ مسلمان یا شرماتے رہے یا بچتے رہے یا دفاع کرتے رہے اور اپنے دیش پریم ووفاداری کو ثابت کرتے رہے، جس کے نتیجہ میں خود اپنے درمیان حب الوطنی اور وطنیت یا وطن پرستی کی بے جا بحثیں وجود میں آئیں، کوئی وطن سے محبت ووفاداری کو جزو ایمان بتانے کی فاش غلطی کرنے لگا تو کسی نے حب الوطنی کو ہی کٹہرے میں کھڑا کر دیا، دراصل یہ دو انتہائیں ہیں جن سے نئی نسل کو بچانا بے حد ضروری ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں ہم کو اس بابت رہنمائی ملتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے نقل کیا ہے: عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ لمكة "ما اطيبك من بلدوا حبك إليّ، ولولا أن قومي أخرجوني منك ما سكنت غيرك. (رواه الترمذي و صححه)

وطن سے محبت ایک اٹل حقیقت اور انسانی فطرت کا تقاضا ہے، اگر وطن سے محبت کا آپ انکار کرتے ہیں تو پھر ہجرت کی مشقت بے معنی ہو جاتی ہے، آدمی جہاں پیدا ہوتا ہے اسکی کسک وہاں سے جانے کے بعد بھی مدتوں محسوس کرتا ہے، اسلام فطرت انسانی کے خلاف نہیں چلتا، اسی لیے اپنے مولد ومسکن سے محبت ووفاداری پر کوئی کلام نہیں کرتا، البتہ اسلام میں مرضی الٰہی سب سے مقدم ہے، حکمِ الٰہی سب

سے برتر ہے، حبِ الٰہی پر آل واولاد اور اموال ووطن سب کو قربان کرنا ہی ایمانی تقاضہ ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے محبت تھی مگر دین کے لیے اس محبت کو قربان کر دیا، یہی تو عین اسلام ہے، کہ کوئی محبت حبِ الٰہی پر غالب نہ آئے، وطن سے محبت انسانی مزاج وطبیعت کا حصہ ہے اسی لیے پورے ذخیرۂ اسلامی میں اس پر نکیر نہیں، وطنیت وقومیت یا قوم پرستی ووطن پرستی دور جدید کے خود تراشیدہ نئے صنم اور عصبیت کی جدید شکلیں ہیں اس لیے اس کی اسلام نفی کرتا ہے، اس پر گفتگو ہونی چاہیے اور کھل کر ہونی چاہیے، مگر کسی چیز کی نفی میں ایسا غلو ٹھیک نہیں کہ ان فطری حقائق کی بھی نفی ہو جن کی رعایت خود دین حق نے کی ہے۔

اب ضرورت اس کی ہے کہ ایسی بے کار وغیر مفید بحثوں کا دروازہ بند کیا جائے، دیش بھکتی اور وطن پرستی کا ثبوت دینے اور اغیار سند و شہادت لینے سے گریز کیا جائے، بلکہ بات اس پہلو پر کی جائے کہ انگریزوں سے وفاداریاں کس کی تھیں، انگریزوں نے پشت پناہی کس کی کی؟ کون ہیں وہ لوگ جن کی غداری نے ہمیشہ تحریک آزادی کو کمزور کیا، ان حقائق پر ہر زبان میں گفتگو ہو اور اس کی ایسی بوچھار کی جائے کہ پھر ہمیں دفاع کے لیے نہ مجبور ہونا پڑے، اس بیانیہ کو بھی تبدیل کرنا از حد ضروری ہے کہ ''ہم بائی چوائس انڈین'' ہیں، اس میں دفاع ہے اور ہم جب برابر کے حق دار ہیں تو آخر دفاع کیوں کریں اس سے ہم کو کہنا چاہیے کہ ہم ''بائی برتھ انڈین'' ہیں۔

دوسری بات یہ کہ ایسے موقع پر ہم کو مستقبل کے اعتبار سے حوصلہ افزا گفتگو کرنا چاہیے، آئندہ کے خاکے پیش کرنا چاہیے، قدیم تاریخی بحثوں میں الجھنے کے بجائے اس ملک میں مسلمانوں کے مستقبل اور امکانات ومواقع پر گفتگو کرنا چاہیے، غلطیوں کے اعتراف و نشاندہی، پالیسیوں کی تبدیلی اور ترجیحات کے صحیح تعین سے اب بھی مسائل حل ہو سکتے ہیں ورنہ بس شکوے، ماتم اور خام خیالی اور اندھے خواب دیکھنے سے کچھ نہیں حاصل ہوگا، دعا یہ کرنی چاہیے کہ ؎

اندھے خوابوں کو اصولوں کا ترازو دے دے

جب تک اصولی محنت نہیں ہوگی صحیح ترتیب کے ساتھ کام نہیں ہوگا، اہداف کا تعین اور اس کے لیے تدریجی، انتھک اور مسلسل محنت نہیں ہوگی تب تک ہمارے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتے، ہم پدرم سلطان بود کرتے رہیں گے اور تاریخ ہمارا گریبان پکڑ کر یہ کہتی رہے گی کہ قومیں تاریخ سے نہیں تحریک وعمل اور جہد مسلسل سے زندہ رہتی ہیں، بقول منصور عثمانی ؎

مسافت منزلوں کی جب ہمارے سر پہ رکھی تھی
فلک کاندھوں پہ رکھا تھا زمیں ٹھوکر میں رکھی تھی

اس لیے ضروری ہے کہ زمانہ ہمیں درست کرے اس سے پہلے ہم خود اپنی حالت پر نظر کر لیں، اپنی تعلیم اور تعلیمی نظام پر نظر ثانی کریں، اپنا صحیح اور بھرپور تعارف کرائیں، برادران وطن سے دوریاں اور فاصلے کم کرنے کی کوشش کریں، مفادات پرستوں کو راہ سے ہٹا کر مخلص نوجوانوں کو آگے بڑھائیں، روایتی سیاسی غلامی سے توبہ کریں اور سیاسی استحکام کے لیے علاقائی سیاست میں اپنے آپ کو مضبوط کریں، علاقائی سطح کی مضبوطی سے آگے کی راہیں کامیابی کے ساتھ طے کرنا قدرے آسان اور مفید ہوگا۔

☆☆☆

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی)

❑ مطالعۂ قرآن ❑ قسط : ۲

کامیابی کی قرآنی علامتیں

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ (۱) الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ (۲) وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ (۳) وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ(۴)وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ(۵)إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ(۶)فَمَنِ ابْتَغَى وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْعَادُونَ(۷)وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ(۸)وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ(۹)أُولَئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ(۱۰)الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ(۱۱)(المؤمنون)

(ترجمہ: یقیناً مومن کامیاب ہیں ، جو اپنی نمازوں میں خشوع و انابت کی کیفیت اختیار کرتے ہیں (خشیت الٰہی کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں)اور جو تمام لغو و فضول اور بے ہودہ باتوں سے دور رہتے ہیں ، اور زکوٰۃ کا اہتمام کرتے ہیں ، (مال کی پاکی اور نفس کی پاکی دونوں کی فکر کرتے ہیں)اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ، ان کی بیویاں اور باندیاں اس پابندی سے مستثنیٰ ہیں ، (ان کے ساتھ زن وشوہر کے تعلقات ہیں) ان پر کوئی ملامت نہیں ، اور جو ان حدود سے آگے بڑھیں گے ، وہ زیادتی اور بدعنوانی کرنے والے شمار ہوں گے ، اور جو اپنی امانتوں اور وعدوں اور معاہدوں کا پاس ولحاظ کرتے ہیں ، اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں ، وہی وارث ہوں گے (یعنی جنت الفردوس کے وارث) جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔)

حقیقی کامیابی

کامیابی کا ہر شخص خواہاں ہے ، اگرچہ زیادہ تر پیش نظر اور مطلوب ومقصود دنیا کی کامیابی ہوتی ہے ، لیکن قرآن مجید آخرت کی کامیابی کو اصل قرار دیتا ہے ، جہنم سے نجات اور جنت کے حصول کو قرآن مجید نے جگہ جگہ ''فوز عظیم'' بڑی کامیابی سے تعبیر کیا ہے ، آخرت کی کامیابی کا مدار دنیا کی کامیابی پر ہے ، دنیا میں جو اہل ایمان کامیاب زندگی گزار کر گئے ہوں گے وہی آخرت میں سرخرو اور فائز المرام ہوں گے ، دنیا میں صالحین ، متقین اور اللہ کے نیک بندوں کو دیکھ کر یہ سمجھنا کہ یہ مصائب زدہ لوگ کامیاب کہاں ہیں ، ان کے بالمقابل کفار و فساق و فجار زیادہ پُر لطف زندگی گزارتے ہیں ، اس ظاہری صورت حال سے مغالطہ میں نہیں پڑنا چاہئے ، یہ بات سمجھنے کی ہے کہ دنیا میں مکمل کامیابی کا وعدہ نہیں کیا گیا ، اور پھر

دنیا میں سب کچھ حاصل ہو جائے، ہفت اقلیم کی بادشاہت مل جائے مگر خوف کی نفسیات انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی ہیں، نقصان وفنا کا خطرہ لاحق رہتا ہے، حصول دولت کے بعد اس کی حفاظت کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے، صحت وتندرستی کے بعد بھی بیماریوں سے حفاظت اور حتی الامکان ان اشیاء سے پرہیز کی ضرورت باقی رہتی ہے جن سے بیماری کا خطرہ ہو، اس لیے دنیا میں مکمل کامیابی اور ہر شئے کے حصول کا خیال ہی بے حقیقت قرار پاتا ہے، رہی بات کفار وفجار کے داد عیش کی تو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ یہ دنیا کافر کے لیے جنت ہے۔ "عن أبی هريرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ الدنيا سجن المؤمن وجنة الكافر" (مسلم، ج۶/:۷۴۱۷)

وہ یہیں مست ومگن رہے گا، البتہ مومن دار الجزاء کے لیے دنیا کو دار العمل سمجھ کر عمل کرتا ہے، سنت اللہ بھی یہی ہے کہ ہر زمانے میں انبیاء ان کے اصحاب اور سچے متبعین اور صلحاء امت تکلیفوں میں مبتلا رہے، حضورﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بہترین معاملہ فرماتے ہیں اسے مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں: "عن أبی هريرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ: من يرد الله به خيرا يصب منه" (صحیح ابن حبان، ج۷:۲۹۰۷)۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہﷺ کا ارشاد ہے کہ سب سے زیادہ آزمائش انبیاء کی ہوتی ہے، پھر صالحین کی ہوتی ہے پھر درجہ بدرجہ اپنی صلاح ونیکی کی کے اعتبار سے لوگ آزمائے جاتے ہیں۔ جس قدر ایمان میں پختگی ہوتی ہے اسی قدر آزمائش سخت ہوتی ہے، عن سعد بن ابی وقاص رضی الله عنه قال: قلت يا رسول الله أی الناس أشد بلاء ؟ قال الأنبياء، ثم الأمثل فالأمثل، فيبتلىٰ الرجل على حسب دينه، فإن كان دينه صلبا اشتد بلاء ه، ... (ترمذی: ۴/ ۲۳۹۸)

اس مضمون کو قرآن نے بھی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جنت تو بہر حال ابتلاء وآزمائش کے بعد ملے گی: أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُواْ الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْاْ مِن قَبْلِكُم مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاء وَالضَّرَّاء وَزُلْزِلُواْ حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُواْ مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللّهِ أَلا إِنَّ نَصْرَ اللّهِ قَرِيبٌ (البقرہ: ۲۱۴)

(ترجمہ: کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جنت میں ایسے ہی داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں وہ حالات پیش نہیں آئے جو گزشتہ قوموں کو پیش آئے تھے، انہیں جسمانی اور مالی تکلیفات کا سامنا کرنا پڑا اور سخت مالی اور جسمانی مصائب سے دوچار ہونا پڑا، یہاں تک کہ وہ ہلا کر رکھ دیے گئے اور رسول اور ان کے ساتھ ایمان والے پکارنے لگے کب اللہ کی مدد آئے گی (پھر اللہ کی طرف سے فرمایا گیا کہ) سن لو، کہ نصرت الٰہی قریب ہے۔)

سورہ عنکبوت میں فرمایا گیا: الم (۱) احسب الناس ان يتركوا ان يقولوا اٰمنا وهم لا يفتنون (۲) ولقد فتنّا الذين من قبلهم فليعلمن الله الذين صدقوا وليعلمن الكٰذبين (۳) (ترجمہ: الف لام میم (رموز واشارات) کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کہہ دیں گے کہ ہم ایمان لائے، اور ان کو آزمائش کی بھٹی میں نہیں تپایا جائے گا، ہم نے ان سے پہلے بھی لوگوں کو آزمائشوں سے گزارا، اور اللہ دیکھے گا کون جھوٹے ہیں۔

پھر ایک بات یہ بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام کبھی پر لطف وپر بہار زندگی کے خواہاں نہیں رہے، خود نبی پاک علیہ السلام کا فقر وفاقہ اختیاری تھا، مشرکین مکہ

عام طور پر یہ اعتراض کیا کرتے تھے کہ یہ کیسے رسول ہیں جو کھاتے بھی ہیں، پیتے بھی ہیں اور بازاروں میں بھی اپنی معاشی ضروریات کے لیے جاتے ہیں، ان کا کہنا تھا کہ رسول تو کسی فرشتہ کو ہونا چاہئے یا کم از کم رسول کا مشیر و مصاحب تو ضرور کسی فرشتہ کو ہونا چاہئے، لیکن ظاہر ہے کہ ان کا یہ اعتراض بے عقلی پر مبنی تھا، رسول اللہ ﷺ کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا، اور اسوۂ حسنہ وہی ہے جس میں کمال ہو، اس میں کوئی شک نہیں کہ روئے زمین پر صرف انبیاء علیہم السلام کی ہی شخصیات ہی کامل و مکمل ہوئی ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ اگر کسی فرشتہ کو اسوۂ حسنہ و کاملہ بنا کر بھیجا جاتا تو انسان کے لیے وہ نمونہ کیوں قرار پاتا، نمونہ بننا تو تب ہی ممکن ہے جب انسانی ضروریات کے ساتھ رضائے الٰہی کا ہر لمحہ خیال رکھا جائے، اسی لیے سیرت طیبہ کے اس پہلو کی اہمیت بہت زیادہ ہے جو عالم اسباب کے موافق اور انسانوں کے لیے قابل عمل ہے، یعنی جس چیز کو کفار رسول کے لیے عیب سمجھ رہے تھے وہی ان کے کمال کی دراصل دلیل ہے، انبیاء علیہم السلام نے باوجود معصوم ہونے کے یہی تو کر کے دکھایا، خود نبی پاک ﷺ اس قدر عبادتیں کرتے، نمازیں پڑھتے کہ آپ ﷺ کے پاؤں پر ورم آجاتا، آپؐ سے نے عرض کیا گیا آپ ﷺ اس قدر محنت کیوں کرتے ہیں جبکہ آپ تو بخشے بخشائے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: کیا میں اپنے پروردگار کا شکر گزار بندہ نہ بنوں "عن المغيرة بن شعبةؓ. أن النبي ﷺ صلىّ حتى انتفخت قدماه. فقيل له أتتكلّف هذا، وقد غفر لك ما تقدم من ذنبك وما تأخر، فقال: أفلا أكون عبداً شكوراً"۔ (مسلم، ج۶: ۲۱۲۴)

کفار کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ نبی کی زندگی اس قدر زاہدانہ کیوں ہے، یہ تو فقر و فاقہ کے مارے ہوئے ہیں، ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ کم از کم ان کا کوئی خاص خزانہ ہوتا جس سے وہ اپنے معاش کی ضروریات پوری کرتے، کوئی خاص باغ ہوتا جس سے ان کے رزق کا انتظام ہوتا۔

وَقَالُوا مَالِ هَـٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ لَوْلَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيراً (۷) أَوْ يُلْقَىٰ إِلَيْهِ كَنزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا وَقَالَ الظَّالِمُونَ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلاً مَّسْحُوراً (۸)۔(الفرقان:)

ترجمہ: اور یہ کہتے ہیں کہ یہ رسول کیسا ہے، جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، کیوں کوئی فرشتہ ان پر نہیں اتار دیا جاتا، جو ان کے ساتھ اعلان کرتا پھرے، یا ان کو خزانے دیئے جائیں یا ان کے باغات ہوں، جہاں سے یہ کھائیں۔

چونکہ کفار اس بات سے نابلد تھے کہ نبی کی بعثت تزکیۂ اخلاق و اعمال اور تزکیۂ ظاہر و باطن کے لیے ہے، اس لیے نبی کا چلنا، پھرنا، کھانا، پینا، بازار جانا، ضروریات کا حاصل کرنا، خرید و فروخت، ان سب اعمال کے ذریعہ امت کی تعلیم اور ظاہری اور باطنی اعمال کی تطہیر کرنا اصل مقصد ہے، قرآن مجید نے یہاں ایک اجمالی جواب دیا اور گویا ان کی بے عقلی پر ایک لطیف تبصرہ کیا۔

انظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلاً۔(الفرقان :۹)

ترجمہ: اور ظالم بدکار کہتے ہیں کہ تم لوگ ایک سحر زدہ شخص کے پیچھے چلتے ہو، دیکھیں آپ کے لیے کیسی مثالیں دے رہے ہیں، (یہ ان باتوں کی وجہ سے) گمراہ ہو رہے ہیں، صحیح راستہ سے محروم ہو رہے ہیں۔

پھر آگے ان کے اس بے بنیاد اعتراض اور ان کی کج فکری پر مبنی ان کی خواہش کا جواب دیا جس کا نقل کرنا یہاں اصل مقصود ہے۔

تَبَارَكَ الَّذِيْ إِن شَاء جَعَلَ لَكَ خَيْراً مِّن ذَلِكَ جَنَّاتٍ تَجْرِيْ مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَيَجْعَل لَّكَ قُصُوراً۔ (الفرقان: ۱۰)

ترجمہ: وہ ذات بڑی بابرکت ہے جو اگر چاہے تو آپ کے لیے ان سب سے بہتر ایسے باغات کا انتظام فرما دے جن کے نیچے نہریں چل رہی ہوں، اور آپ کے لیے شاندار محلات تیار کرادے۔

قرآن مجید نے یہاں پر یہ واضح کر دیا کہ یہ چیزیں زندگی کا جزء لاینفک نہیں، اور فی الواقع آپ کو اس کی ضرورت نہیں، ورنہ ان کا مطالبہ تو مطلق باغ کا ہے ہم تو آپ کو اس سے بہتر باغات ومحلات عطا کرتے، حضرت ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا: کہ میں آپ کے لیے پورے بطحاء مکہ اور اس کے پہاڑوں کو سونا بنا دیتا ہوں، تو میں نے عرض کیا، کہ نہیں اے میرے پروردگار مجھے تو یہ پسند ہے کہ ایک دن مجھے پیٹ بھر کھانا ملے اور اس پر میں شکر ادا کروں، دوسرے دن بھوکا رہوں اور اس پر میں صبر کروں۔" عن أبی أمامة عن النبی ﷺ قال: عرض علی ربی أن یجعل لی بطحاء مکة ذهبا فقلت یا رب ولکن أشبع یوماً و أجوع یوماً" (ترمذی ۴/ ۲۳۴۷)

اسی طرح حضرت عائشہؓ کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں چاہتا تو سونے کے پہاڑ میرے ساتھ پھرا کرتے۔

اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ کامیابی درحقیقت آخرت کی کامیابی ہے، دنیا کی عیش وعشرت نہ انبیاء کا طریقہ رہا اور نہ ان کا پسندیدہ عمل، خود آپ ﷺ کے صحابہ کا فقر وزہد بھی اختیاری تھا، فتوحات کا دور آیا، ریاست قائم ہوئی، بیت المال میں خزانے جمع ہوئے، صحابہ کرام کو اللہ نے دنیا کی وسعتوں سے نوازا، لوگوں کے سرکاری وظائف متعین ہوئے، مگر وہی بے نفسی، وہی خدا مستی، مال ومتاع سے وہی بے رغبتی، گھر آئی دولت وکشائش کو لٹانے کا جذبہ، جس طرح صدقہ دراصل وہ ہے جو ضرورت کے وقت اور فقر کا خوف لاحق ہونے کے باوجود کیا جائے (مسلم ۳/ ۲۳۸۲) جس طرح معافی وہ ہے جو قدرت کے باوجود دی جائے، اسی طرح استغناء فی الحقیقت وہ ہے جو اسباب ووسائل مہیا ہونے کے بعد اختیار کیا جائے، استغناء کا تعلق دل سے ہے، اگر مالداری کے باوجود دل کو استغناء کی کیفیت سے آشنائی نہیں ہے تو پھر مالدار کی حالت فقیروں سے بدتر ہوتی ہے، حدیث میں فرمایا گیا: "إن الغنی غنی النفس" (مسلم ۳/ ۲۴۲۰) اس لیے کفار ومشرکین کی دنیا داری اور چمک دمک دیکھ کر ان کو کامیاب تصور کرنا لاعلمی اور کامیابی کے اصل معنیٰ ومفہوم سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے۔ دنیا کے تئیں مومنانہ سوچ جذبۂ شکر گزاری کے ساتھ اس کے استعمال اس کافرانہ رویہ، غفلت وسرمستی میں ڈوبی زندگی کی قرآن پاک میں ایک تمثیل بیان کی گئی ہے یہاں من وعن بغیر کسی تفصیل وتشریح کے نقل کی جاتی ہے:

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلاً رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعاً (۳۲) كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ آتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئاً وَفَجَّرْنَا خِلَالَهُمَا

نَهَراً(٣٣) وَكَانَ لَهُ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا أَكْثَرُ مِنكَ مَالاً وَأَعَزُّ نَفَراً(٣٤)وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ قَالَ مَا أَظُنُّ أَن تَبِيدَ هَذِهِ أَبَداً(٣٥) وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِن رُّدِدتُّ إِلَى رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْراً مِّنْهَا مُنقَلَباً(٣٦) قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّاكَ رَجُلاً(٣٧) لَّكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَداً(٣٨)وَاضْرِبْ ل وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاء اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ إِن تَرَنِ أَنَا أَقَلَّ مِنكَ مَالاً وَوَلَداً(٣٩) فَعَسَى رَبِّي أَن يُؤْتِيَنِ خَيْراً مِّن جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَاناً مِّنَ السَّمَاءِ فَتُصْبِحَ صَعِيداً زَلَقاً(٤٠) أَوْ يُصْبِحَ مَاؤُهَا غَوْراً فَلَن تَسْتَطِيعَ لَهُ طَلَباً(٤١)وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلَى مَا أَنفَقَ فِيهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا وَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّي أَحَداً(٤٢)وَلَمْ تَكُن لَّهُ فِئَةٌ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مُنتَصِراً(٤٣) هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَاباً وَخَيْرٌ عُقْباً(٤٤) (الكهف)

(ترجمہ:اوران کے سامنے ان دوشخصوں کا تذکرہ کیجئے ،جن میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغات دے رکھے تھے،اوران کو کھجور کے درختوں سے گھیر رکھا تھا،اوران کے در میان کھیتیاں تھیں ،دونوں باغات نے خوب پھل دیئے،کوئی کسر نہ چھوڑی ،اوران کے درمیان ہم نے نہریں جاری کر رکھی تھی ،اورخوب بیداوار ہوتی تھی ،تو اس نے اپنے ساتھی سے باتیں کرتے ہوئے (اورڈینگیں مارتے ہوئے کہا) کہ میرے پاس تم سے زیادہ مال ہےاورتم سے زیادہ افرادی قوت ہے،اوروہ اپنے تکبراوردنیاداری کے نشہ میں اپنے باغ میں گیا،اور(اتراکر) کہنے لگا،کہ میں نہیں سمجھتا کہ میرا یہ باغ کبھی تباہ ہوگا،اور مجھے قیامت کے آنے میں یقین نہیں ہے ،اوراگر مجھے اپنے رب کے پاس جانا بھی پڑا،تب پلٹ کر مجھے اس سے بھی شاندار باغات ملیں گے۔اس کے ساتھی نے بات کرتے ہوئے کہا:کیاتم اپنے خالق کاانکارکرتے ہو،جس نے تمہیں پہلے مٹی،پھرنطفہ سے پیدا کیا،پھرتمہیں ایک مرد بنا کر کھڑا کر دیا،میں تو کہتا ہوں کہ اللہ ہی میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کوشریک نہیں ٹھہراتا،کاش کہ تم اپنے باغ میں جب گئے تھے تو کہتے کہ ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ (جو ہے اللہ کی مشیت سے ہے،اورقوت وطاقت تو بس اللہ کی ہے)اگرتم مجھے مال واولاد میں اپنے سے کم دیکھ رہے ہو(تو اللہ کاشکرادا کرو)ممکن ہے کہ میرا مالک مجھے تم سے بہتر باغ عنایت فرمادےاورتمہارے باغ پرآسمان سے کوئی مصیبت آجائے اور پورا باغ بےآب وگیاہ چٹیل زمین میں تبدیل ہو جائے،یااس کا پانی زمین میں اتنا نیچے چلا جائے کہ اس کا حاصل کرنا تمہارے لیے ناممکن ہو جائے ،اور(آخر کار) اس کی پیداوارسب تباہ کردی گئی،اور جو کچھ اس پرخرچ کر چکا تھا،اس پر اپنے ہاتھ ملنے لگا،باغ بالکل تہس نہس ہو چکا تھا،(سارے ٹٹر جن پرانگور کی بیلیں چڑھی تھیں)نیچے تباہ حال پڑے تھے،اوروہ کہہ رہا تھا کہ کاش میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کوشریک نہ کیا ہوتا،اور پھراس کا کوئی گروہ اور جتھا نہ تھا جو مدد کو آتا اور اللہ کے عذاب سے بچاتا،نہ خود وہ اپنی مدد کی پوزیشن میں تھا،اب وہاں صرف اللہ برحق کی حکمرانی تھی ،وہی بہتر بدلہ دیتا ہے،اور وہی اچھے انجام سے نوازتا ہے۔) (جاری)

(نوٹ:اس مضمون کا بقیہ حصہ آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں)

☆☆☆

❑ مطالعۂ قرآن

ذکرِ الٰہی کے فیوض و برکات

قرآن وحدیث کے حوالے سے

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

ذکرِ الٰہی اہلِ ایمان کے لئے روحانی غذا ہے، اس سے دل کو سکون، دماغ کو تازگی، فکر کو بلندی اور عمل کو پاکیزگی نصیب ہوتی ہے۔

مومن اور ذکرِ الٰہی لازم وملزوم ہیں۔ اللہ رب العزت کو یاد کئے بغیر ایک مومن کی زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا، یہ اس کا دن رات کا وظیفہ ہے، کسی کام میں بھی وہ مصروف رہے، اللہ رب العزت کی یاد سے غافل نہیں رہ سکتا۔ ہر کام شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کی ہدایت اور مختلف مواقع کی مسنونہ دعاؤں کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ کسی کام کی ابتداء وانتہاء ذکر الٰہی سے خالی نہ رہے، اسی سے ربِّ کریم کی توفیق وتائید اور رحمت وعنایت نصیب ہوتی ہے۔ ذکرِ الٰہی کی اہمیت وفضیلت اس سے بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کریم میں اہلِ ایمان کو اللہ کو صرف یاد کرنے کی نہیں، بلکہ خوب یاد کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے: یاایھا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیراً و سبحوہ بکرۃً و اصیلاً (الاحزاب: ۳۳/ ۴۱-۴۲)[اے ایمان والو! اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح وشام اس کی تسبیح بیان کرو]۔ بلاشبہ اللہ کی یاد سب سے بڑی یاد ہے۔ اس حقیقت کے اثبات کے لئے قرآن کی یہ شہادت کافی ہے: ولذکر اللہ اکبر (العنکبوت: ۲۹/ ۴۵)۔ یہ بات محتاجِ وضاحت نہیں کہ کوئی بھی عبادت ذکرِ الٰہی سے خالی نہیں ہوتی اور افضل العبادۃ نماز تو ذکرِ الٰہی کا سب سے بڑا مظہر یا اس کی بہترین عملی صورت ہے، جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے: قد افلح من تزکیٰ وذکر اسم ربّہ فصلّی (الاعلیٰ: ۸۷/ ۱۴)[بے شک کامیاب ہوا وہ شخص جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا اور نماز ادا کی]۔ سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۴ میں ذکرِ الٰہی کے لئے ہی نماز کے اہتمام کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے: انّنی انا اللہ لا إلٰہ الّا انا فاعبدنی و اقم الصلوٰۃ لذکری [بے شک میرے علاوہ کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لئے نماز قایم کرو]۔ یہ بخوبی معروف ہے کہ ''صلوٰۃ'' کے معنی ہی دعا کے ہوتے ہیں اور یہ عبادت (نماز) ابتداء سے خاتمہ، بلکہ اس کے بعد تک دعاء ہی دعاء ہے۔ وضوء کے اہتمام اور بسم اللہ پڑھنے سے لے کر آخر تک کی تسبیحات، تکبیرات، قرآنی آیات کی تلاوت اور سلام پھیرنے کے بعد دعائیں، پوری کی پوری نماز کو ذکرِ الٰہی ودعاء سے تعبیر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ان سب

کے علاوہ قرآن وحدیث میں مسلسل اور کثرت سے اللہ کو یاد کرنے اور دعاء مانگنے کی ترغیب دی گئی ہے، یعنی نماز کے اندر اور باہر ہر حال میں دعاء وذکرِ الٰہی مطلوب ہے۔ مزید برآں یہ بات احادیث سے ثابت ہے کہ ذکر ودعاء آپ ﷺ اور اصحابِ کرامؓ کا معمول رہا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نماز وذکرِ الٰہی سے اللہ ربّ العزت سے تعلق مضبوط ہوتا ہے اور یہ عبادت اللہ تعالیٰ کی عظمت وبزرگی کا احساس دلا کر اس کی نافرمانی اور گناہ کے ارتکاب سے باز رکھتی ہے، جیسا کہ سورۃ العنکبوت کی مذکورہ بالا آیت میں پہلے اس کتاب ہدایت کی تلاوت اور اس کی اتباع میں سب سے بڑے فریضہ (نماز) کی ادائیگی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اس کی یہی تاثیر بیان کی گئی ہے:

ارشادِ ربّانی ہے: اتلُ ما اوحی الیك من الکتاب واقم الصلوٰۃ انَّ الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء و المنکر و لذکر اللہ اکبر [اس کتاب کی تلاوت کریں جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اور نماز قائم کریں، بے شک نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا (ذکر) ہے]۔

یہ نکتہ بڑی اہمیت کا حامل اور لائقِ توجہ ہے کہ ذکرِ الٰہی کے لئے نماز کے اہتمام کی وضاحت، اس کی تاکید اور اس کی خاصیت بیان کرنے کے ساتھ متعدد آیات میں نماز کی ادائیگی سے فراغت کے بعد بھی کثرت سے ذکرِ الٰہی کی ہدایت دی گئی ہے، جو بلاشبہ ایک مومن کی زندگی میں اس کی اہمیت وفضیلت پر دالّ ہے۔ قرآن کریم اپنے ماننے والوں کو یہ تاکید کرتا ہے کہ فرض عبادات کی بجا آوری کے بعد وہ کسب معاش کی جس مصروفیت سے بھی منسلک رہیں، اللہ کو یاد کرتے رہیں، یعنی ذکرِ الٰہی سے کسی حال میں غافل نہ ہوں۔ ارشادِ ربّانی ہے: فاذا قضیتم الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض و ابتغوا من فضل اللہ و اذکروا اللہ کثیراً لعلّکم تفلحون (الجمعۃ: ۶۲/۱۰) [اور جب نماز ختم ہو جائے تو فضلِ الٰہی (معاش) کی تلاش میں زمین میں بکھر جاؤ اور اللہ کو خوب یاد کرو تو تم فلاح پاؤ گے]۔ ظاہر ہے کہ معاشی مصروفیات میں ذکرِ الٰہی سے غفلت کا اندیشہ رہتا ہے، نفس کو ورغلانے کا موقع ملتا ہے۔ اس سے حفاظت کا اہتمام دیکھئے کہ اسی آیت میں یہ ہدایت دی گئی کہ (فضلِ الٰہی تلاش کرتے ہوئے) اللہ کا ذکر کثرت سے کریں۔ مذکورہ آیت اور اس کی ہدایات کا تعلق خاص طور سے نمازِ جمعہ سے ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں بار بار ذکرِ الٰہی کی تاکید اور کسی بھی حالت میں اس سے غافل نہ رہنے کی ہدایت کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر نماز کے بعد صاحبِ ایمان سے (اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہوئے) یہی رویہ مطلوب ہے۔ میدانِ جنگ کا موقع بلاشبہ بے اطمینانی، عدیمِ الفرصتی اور خوف واضطراب کا ہوتا ہے، اس حالت میں بھی مجاہدین کو ہدایت دی گئی کہ وہ باری باری فرض نماز ادا کریں گے، اس کے بعد وہ جس حالت (بیٹھے، کھڑے، لیٹے) میں رہیں اللہ کا ذکر کرتے رہیں اور یہ نہ سمجھیں کہ فرض نماز کی بجا آوری کے بعد اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی، اللہ سے تعلق کی مضبوطی اور اس کی نصرت طلب کرنے کے لئے ذکرِ الٰہی ہر حال میں ضروری ہے۔ سورۃ النساء (آیت ۱۰۳/) میں جنگ کے محاذ پر نماز کی ادائیگی کا طریقہ بتانے کے بعد ارشاد ہوا: فاذا قضیتم الصلوٰۃ فاذکروا اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبکم [اور جب تم لوگ نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو]۔ رمضان کی فرضیت سے متعلق آیات میں روزہ کی فرضیت کا سب سے بڑا مقصد تقویٰ سے آراستگی کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں یہ بھی واضح کیا گیا کہ اس سے مقصود اللہ کی کبریائی کا اظہار (یعنی اللہ

اکبر کی یاد تازہ رکھنا) اور اس عظیم نعمت میسر ہونے پر شکرِ الٰہی کے جذبہ سے معمور ہونا بھی ہے: لتکبّروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم ولعلکم تشکرون (البقرۃ:۲/۱۸۵)[تاکہ تم اللہ کی کبریائی بیان کرو اس فضل پر کہ اس نے تمھیں اس کی ادائیگی کی راہ دکھائی اور تاکہ تم (اس بابرکت مہینہ نصیب ہونے پر) اللہ کا شکر ادا کرو]۔اسی طرح اس سے ہم سب واقف ہیں کہ حج کی ادائیگی کے دوران تلبیہ، تکبیر و تسبیح کا دور دورہ رہتا ہے، یعنی اس فریضہ کی ادائیگی میں مسلسل ذکرِ الٰہی کی مصروفیت رہتی ہے۔اس دوران بھی اللہ کو یاد کرنے کی خاص تاکید ملاحظہ کریں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فاذا قضیتم مناسککم فاذکروا اللہ کذکرکم آباءکم او اشد ذکرا (البقرۃ:۲/۲۰۰)[اور جب تم لوگ حج کے ارکان پورے کرلو تو اللہ کو یاد کرو، جس طرح تم اپنے آباء واجداد کو یاد کرتے ہو یا]۔اس میں دراصل اشارہ ہے جاہلی دور کی رسم کی طرف کہ عرب کے لوگ حج سے فارغ ہوکر منیٰ میں اپنے آباء و اجدا دکو یاد کرتے ہوئے ان کے کارناموں پر فخر کرتے تھے۔یہ آیت اہلِ اسلام کو یہ پیغام دے رہی ہے کہ یہ موقع ہے اللہ کو خوب یاد کرنے کا، نہ کہ جاہلی دور کی طرح آباء واجداد کے کارناموں پر ڈینگیں مارنے کا۔غزوۂ بدر کے موقع پر اہلِ ایمان کو مخالفین سے مقابلہ میں ثابت قدم رہنے کا حکم دیتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہوا: یاایھا الّذین آمنوا اذا لقیتم فئۃ فاثبتوا واذکروا اللہ کثیراً لعلّکم تفلحون (الانفال:۸/۴۵)۔[اے ایمان والو! جب تمہارا کسی لشکر سے سامنا ہو تو جمے رہو اور اللہ کو خوب یاد کرتے رہو، اسی میں تم سب کی فوز وفلاح ہے۔] مزید یہ کہ وقت کے جابر وظالم بادشاہ (فرعون) کے پاس حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام کو بھیجتے ہوئے اللہ نے ارشاد فرمایا: اذھب انتَ و اخوک بآیتی ولا تنیا فی ذکری (طٰہٰ:۲۰/۴۲)[تم اور تمھارے بھائی میری نشانیاں لے کر جائیں اور [اس دوران] میری یاد میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرنا]، یعنی تم دونوں ایک عظیم و پاکیزہ مشن پر جارہے ہو، اسے پورا کرنے کے دوران میری یاد سے ذرا بھی غفلت نہ برتنا، میرا ذکر ہی تمھارے لئے باعث تقویت ہوگا۔سورۃ الکہف کی ایک چھوٹی سی آیت ۲۴ میں ایک نہایت اہم موقع پر اللہ کو یاد کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ ہدایت دینے کے بعد ارشادِ الٰہی ہے: واذکر ربّکَ اذا نسیتَ [جب بھول جانا تو اپنے رب کو یاد کرلینا]۔بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اگر ہدایتِ ربّانی پر عمل میں کوئی کوتاہی ہوجائے تو فوراً اپنے رب کو یاد کرلو، اس سے ہدایت پر اچھی طرح عمل کی یاددہانی ہوگی اور رجوع الی اللہ کی یہ کیفیت استغفار بھی بن جائے گی (حافظ صلاح الدین یوسف، تفسیر احسن البیان، دار السلام، ریاض، بدون تاریخ، ص ۳۸۸، حاشیہ نمبر۔۱۱،۱۲)۔

اسی کتابِ ہدایت میں اہلِ ایمان کا یہ وصفِ خاص بیان کیا گیا ہے کہ وہ اٹھتے، بیٹھتے، لیٹے ہر حالت میں اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔فرمانِ الٰہی ہے: الّذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً و علیٰ جنوبھم و یتفکّرون فی خلق السمٰوٰت والارض (آل عمران:۳/۱۹۱)[جو اٹھتے بیٹھتے، پہلو کے بل لیٹے اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمان وزمین کی تخلیق میں غور کرتے رہتے ہیں]۔ذکرِ الٰہی کے باب میں مومنین صادقین کی کیفیت تو یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اسے اس طرح اپنی روزمرہ زندگی کا معمول بنا لیتے ہیں کہ ان کی معاشی مصروفیات (جو انہیں بہت محبوب ہوتی ہے) بھی اس محبوب مشغلہ سے انہیں غافل نہیں ہونے دیتیں۔ارشادِ ربّانی ہے: رجال لاتلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ و اقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ یخافون یوماً تتقلب فیہ

القلوب والابصار (النور:۲۴/۳۷)[وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں تجارت وخرید وفروخت بھی اللہ کو یاد کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کر پاتی، (اس لئے کہ) وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس دن دل اور دیدے الٹ پلٹ جائیں گے]۔ مفسرین عام طور پر اس آیت کا مصداق صحابۂ کرامؓ کو قرار دیتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طور پر اہل ایمان کو کثرت سے ذکر الٰہی کی تاکید کی گئی ہے اور اس کے فیوض وبرکات کی جانب انہیں بار بار متوجہ کیا گیا ہے اس کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہر مومنِ صادق سے معاشی مصروفیات کے دوران یہی رویہ مطلوب ہے۔ دراصل یہ تو اہلِ ایمان کے امتیازات میں سے ہے کہ وہ نماز میں اور نماز کے علاوہ اوقات میں بھی اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں، ذکرِ الٰہی کے بغیر کسی کروٹ ان کو چین نہیں ملتا۔ کوئی نیک عمل انجام دیتے ہیں تو بھی اللہ کو یاد کرتے ہوئے اس کی جنابِ عالی میں شکر بجا لاتے ہیں کہ اس کی توفیق ہی سے انہیں یہ شرف میسر ہوتا ہے۔

مزید یہ کہ مومنین صادقین کا یہ شیوہ ہے کہ جب ان سے کوئی غلطی ہوجاتی ہے، یا کسی گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں تو بھی اللہ کو یاد کرتے ہیں، کس مقصد سے؟ اس پر متنبہ ہونے پر اظہارِ ندامت کی خاطر، اللہ کی گرفت کے خوف سے اس کی مغفرت طلب کرنے کے لئے، ربِّ کریم کے حضور حاضری اور باز پرس کے احساس سے آئندہ دانستہ طور پر گناہ سے دور رہنے کا عزم ظاہر کرنے کے لئے۔ سورہ آل عمران کی آیت ۱۳۵/ مومنین کی اسی باطنی کیفیت اور مغفرت طلبی کی ترجمان ہے: والّذین اذا فعلوا فاحشة او ظلموا انفسهم ذكروا الله فاستغفروا لذنوبهم ومن يغفر الذنوب الّا الله ولم يصرّوا علىٰ ما فعلوا وهم يعلمون (اوران[اہلِ تقویٰ] کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی فحش کام ان سے سرزد ہوجاتا ہے یا[کسی گناہ میں ملوث ہوکر] اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو وہ فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں، اپنے گناہوں کی مغفرت چاہتے ہیں، اور[وہ خوب جانتے ہیں کہ] اللہ کے علاوہ کون ہے جو گناہوں کو معاف کرے، اور وہ جو کچھ[غلطی] انہوں نے کی ہے اس پر اصرار نہیں کرتے)۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ سرزد ہوجانے پر مومنین صدقِ دل سے توبہ واستغفار کر لیتے ہیں اور جان بوجھ کر اس غلطی کے بار بار ارتکاب کی جراءت نہیں کرتے۔ اس آیت کے حوالے سے ایک عارف باللہ (مولانا شاہ حکیم اخترؒ) نے بڑی قیمتی باتیں تحریر فرمائی ہیں۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں ذکر اللہ سے مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے والے یا اس کے بندوں کے حقوق مارنے والے اہلِ ایمان ایسا کرکے ہاتھ میں تسبیح لے کر سبحان اللہ، سبحان اللہ پڑھنے لگتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ سرزد ہونے پر وہ اللہ کی عظمت وکبریائی کو یاد کرتے ہیں، اس کی وعید اور عذاب کو یاد کرتے ہیں، اس کے جلال کو یاد کرکے لرز جاتے ہیں، اللہ رب العزت کے حضور اپنی پیشی کو یاد کرتے ہیں اور اس سب سے بڑی پیشی کے منظر کو یاد کرتے ہیں کہ گناہوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوئی تو وہ کیا جواب دیں گے، یعنی ان تمام باتوں اور مناظر کو یاد کرکے خطا کار مومن بندے ربِّ کریم سے رجوع کرتے ہیں اور اپنے کئے پر شرم سار ہوتے ہوئے معافی مانگتے ہیں کہ اے اللہ! میری مغفرت فرما ورنہ مجھے کہیں پناہ نہیں ملے گی، مجھے تیرے سوا کوئی بچا نہیں سکتا، تیرے علاوہ میرا کوئی کارساز نہیں ہے (دعوۃ الحق، پرنام بٹ[تامل ناڈو] ۲/۱۴، فروری ۲۰۱۷ء، ص ۹۔۱۱)۔

اوپر یہ ذکر آچکا ہے کہ قرآن کریم میں اہلِ ایمان کو (خواہ مرد ہوں یا عورت) حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کو کثرت سے یاد کریں اور یہ کہ اللہ کو خوب یاد کرنا ان کے امتیازی اوصاف

میں سے ہے۔ بلاشبہ نبی کریم ﷺ حکم الٰہی پر عمل میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ رفیقۂ حیات سے بڑھ کر اپنے رفیقِ حیات کے احوال سے کون واقف ہوسکتا ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ کا یہ قول بہت معروف ہے کہ آپ ﷺ اخلاق و کردار میں قرآن کی تعلیمات کا مجسم تھے۔ انہی ام المومنینؓ کی یہ روایت ہے: کان رسول الله ﷺ یذکر الله عزّ و جلَّ علیٰ کُلِّ احیانہ (جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب ما جاء انَّ دعوۃ المسلم مستجابۃ) [اللہ کے رسول ﷺ ہر وقت اللہ کو یاد کیا کرتے تھے]۔ مزید براں نبی کریم ﷺ اور صحابۂ کرام کو جب بھی کوئی اہم بات پیش آتی تو ان کی زبان پر بے ساختہ ''اللہ اکبر'' کی صدا بلند ہوجاتی، کسی اونچائی پر چڑھتے تو اللہ اکبر کی آواز بلند کرتے، نیچے اترتے تو بھی تسبیح کہتے، جیسا کہ حضرت جابر ابن عبداللہ ﷺ سے روایت ہے: کُنّا اذا صعدنا کبّرنا واذا نزلنا سبّحنا (صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب التسبیح اذا ھبط وادیاً؛ مجیب اللہ ندویؒ، اسوۂ حسنہ، ص۲۶۴)۔ اسی ضمن میں اس حدیث کا حوالہ بھی برمحل معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے آپ ﷺ سے سوال کیا کہ اسلام کے احکام تو میرے لئے بہت ہیں، مجھے ایسی بات بتلایئے کہ میں اسے مضبوطی سے پکڑ لوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لا یزالُ لسانك رطباً من ذکر الله (جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب ما جاء فی فضل الذکر) [تیری زبان ہمیشہ اللہ کی یاد سے تَر رہے]۔ اس حدیث کی تشریح میں شارحِ ''ریاض الصالحین'' تحریر فرماتے ہیں کہ ''اللہ کے ذکر سے زبان کو تر رکھنے کا مطلب ہے مداومت کرنا، یعنی اللہ کے ذکر کو اپنا مستقل دائمی معمول بنالے'' (ریاض الصالحین، ۲/۲۵۵)۔ ذکرِ الٰہی کے تین معروف طریقے ہیں: ذکر باللسان، ذکر بالقلب اور ذکر بالعمل (یعنی تحمید، تسبیح کے کلمات کے توسط سے اللہ کو یاد کرنا، دل میں اللہ کی کبریائی وعظمت اور سبّوحیت وقدوسیت کا احساس تازہ رکھنا اور عمل کے ذریعہ اللہ کو یاد کرنا)۔ حقیقت یہ کہ تیسرا طریقہ، جو اولین دونوں طریقوں کا ماحصل ہے، خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر کام کو شروع کرتے وقت اس سے متعلق اللہ کے حکم کو یاد کرنا اور یہ ملحوظ رکھنا کہ اس وقت ہمارا رب ہم سے کیا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی اصل دین داری ہے اور دین پر صدقِ دل سے عمل کا یہی تقاضا ہے۔ اس ضمن میں ایک بزرگ کے قول کے حوالے سے ممتاز عالمِ دین مولانا مفتی تقی عثمانی کا یہ بیان نقل کرنا اہمیت سے خالی نہ ہوگا۔ خود ان کے الفاظ میں:

> ''دین نام ہے وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا کہ اس وقت دین کا مجھ سے کیا مطالبہ ہے؟ اسی مطالبے کو پورا کرنے کا نام ''دین'' اور ''اتباع'' ہے، اپنا شوق پورا کرنے اور اپنی تجویز پر عمل کرنے کا نام دین نہیں''

(مفتی محمد تقی عثمانی، اصلاحی خطبات (ضبط وترتیب: محمد عبداللہ میمن)، کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند، ۲۰۰۷ء، جلد۔ ۱۶، ص ۷۶)۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنی مرضیات کو اللہ کی مرضی کے تابع کردینا اور ہر عمل کی انجام دہی کے وقت حکامِ الٰہی کو یاد رکھنا، اسی کا نام ''اسلام'' ہے اور دینِ برحق اپنے ماننے والوں سے اسی کا مطالبہ کرتا ہے۔ بلاشبہ اصلاحِ احوال یا اپنے حالات کو سدھارنے کے لئے ذکر بالعمل کی زیادہ اہمیت ہے، لیکن عام صورتِ حال یہ ہے کہ ذکرِ الٰہی کے اس پہلو پر لوگوں کی کم توجہ ہوتی ہے، جب کہ قرآن وسنت کی رو سے ہر مومن سے یہی مطلوب ہے کہ ہر عمل وہر اقدام کے وقت اللہ کے حکموں کو یاد رکھیں۔

ذکرِ لسانی کے لئے قرآن وحدیث میں تحمید، تسبیح وتعظیم

کے بہت سے کلمات ملتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو اسمائے حسنیٰ کے ساتھ یاد کرنا ذکرِ لسانی کا بہترین طریقہ ہے۔حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں نبی کریمﷺ نے لا الٰہ الاّ اللہ کو افضل ذکر فرمایا ہے: [افضل الذکر لا الہ الّا اللـه] (جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء انَّ دعوۃ المسلم مستجابۃ) ۔ذکرِ الٰہی و تسبیح کے دو پاکیزہ کلمات (سبحان الله و بحمده، سبحان الله العظيم) کے بارے میں نبی کریمﷺ کا ارشاد ہے: خفيفتان على اللسان ،ثقيلتان فى الميزان و حبيبتان الى الرحمٰن (صحیح مسلم کتاب الذکر والدعاء، باب فضل التہلیل و التسبیح والدعاء)[یہ کلمات [ادائیگی میں] زبان پر ہلکے، میزانِ [عمل] میں بھاری اور اللہ رحمٰن کو محبوب ہیں]۔حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسولﷺ نے فرمایا: لَان اقول "سبحان الله، والحمد لله، ولاالٰه الّا الله والله اكبر احبُّ الیَّ ممّا طلعت عليه الشمس" (صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل التہلیل والتسبیح والدعاء) [مجھے زبان سے یہ کلمات ادا کرنا ان تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے [یعنی یہ کلمات دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ مجھے عزیز ہیں]۔ان کلمات کے فضائل و برکات پر یقین رکھنے کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مومن بندہ اللہ کی عظمت و کبریائی، حمد و ثناء کے کلمات جس زبان میں بھی ادا کرے وہ اس کے لئے ان شاء اللہ تعالیٰ موجب خیر و برکت ہوں گے۔ذکرلسانی کے برکات کے ضمن میں یہ وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ سامنے آتا ہے کہ اس طور پر ذکرِ الٰہی میں مصروف رہنے والا (یعنی زبان سے تحمید، تسبیح کے کلمات ادا کرنے والا) بدزبانی کی آلائشوں ،یعنی جھوٹ، غیبت، چغل خوری، طعنہ زنی وغیرہا بہت سی خرافات اور غلط حرکتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ذکرِ لسانی کے اسی فیض کی جانب توجہ دلاتے ہوئے درسِ قرآن کے ماہر مولانا حافظ سید عبدالکبیر عمری تحریر فرماتے ہیں:"ذکرِ الٰہی کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی اس کی پابندی کرنے سے زندگی کے ہر مرحلہ میں گناہوں سے محفوظ رہتا ہے،اس لیے کہ اللہ کو یاد کرتے ہوئے آدمی کسی گناہ کا ارتکاب مشکل ہی سے کرے گا" (نور ہدایت۔قرآنی دروس کا مجموعہ،عمرآباد،۲۰۱۴ء،ص ۸۷)۔

حقیقت یہ ہے کہ ذکرِ الٰہی کے فیوض و برکات اتنے زیادہ ہیں کہ ایک مضمون کیا ، پوری ایک کتاب بھی ان کی وضاحت کے لئے ناکافی ہوگی۔اللہ رب العزت اپنے بندوں پر کس قدر مہربان ہے کہ اس نے اپنی کتاب عزیز میں یہ بھی واضح کردیا کہ ذکرِ الٰہی سے کیا فیوض و برکات نصیب ہوتے ہیں ۔ان سے متعلق قرآنی آیات سے جو کچھ واضح ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذکر الٰہی سے اللہ رب العزت سے تعلق مضبوط ہوتا ہے، اللہ کی قربت، نصرت و رحمت نصیب ہوتی ہے اور آزمائشی حالات میں ثبات واستقلال کا دامن ہاتھ آتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فاذكرونی اذكركم (البقرة:۱۵۲/۲) [تم لوگ مجھے یاد کرو، میں تجھے یاد کروں گا]۔یہ بخوبی معروف ہے کہ اللہ کا اپنے کسی بندہ کو یاد کرنا اس کا اپنی رحمت وعنایت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہونا ہے۔اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان عنایات سے سرفراز کیا جانا اللہ کی محبت وقربت کی نشانی ہے۔ ربِّ کریم و مالک الملک کسی عاجز ومحتاج بندہ کو یاد کرے اور اس سے قریب ہونے کا ذکر کرے، یہ کتنا بڑا اشرف واعزاز ہے جس سے وہ مشرف کیا جارہا ہے۔ایک حدیثِ قدسی سے اس نکتہ کی مزید وضاحت ملتی ہے۔حدیثِ قدسی میں نبی کریمﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:انا معه حين يذكرني (صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الذکر والدعاء والتقرب

الی اللہ) [جب وہ (بندہ) مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں]۔ یعنی ذکرِ الٰہی میں مصروف رہنے والے کو اللہ کی قربت ونصرت نصیب ہوتی ہے۔ یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ سورۃ البقرۃ کی مذکورہ بالا آیت کے حوالے سے اللہ کے کسی بندہ کو یاد کرنے کے بارے میں مولانا مفتی محمد عبداللہ پھول پوریؒ نے ایک تذکیری مجلس میں سیدھے سادے مگر نہایت دل نشیں انداز میں یہ اظہارِ خیال فرمایا تھا: ''ارے بھائی! جب بادشاہ کسی کے گھر آتا ہے تو اپنی بادشاہت کے ساتھ آتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ جب آپ کو یاد فرمائیں گے تو کیا بس یوں ہی یاد فرمائیں گے؟ نہیں، بلکہ فرماتے ہیں کہ میں تم کو اپنی بے پناہ نعمتوں کے ساتھ یاد کروں گا، اپنی رحمتوں کے ساتھ یاد کروں گا، اپنی جنت کے ساتھ یاد کروں، میری یاد مفت میں نہیں ہوگی۔ یہی کیا کم ہے کہ آپ کا چرچا سارے عالم میں ہوجائے گا، اس سے بڑی دولت آپ کے لئے اور کیا ہوسکتی ہے؟'' (مفتی محمد عبداللہ پھول پوریؒ، نوائے اہلِ دل، اشرفی کتب خانہ، پھولپور، ۲۰۱۹ء، ص ۲۹)۔

بلاشبہ جس شخص کو اللہ کی قربت و مدد نصیب ہوجائے وہ بڑا خوش قسمت ہے، اسے درحقیقت اطمینانِ قلب کی انتہائی قیمتی نعمت مرحمت ہوگئی، وہ ہر طرح کے رنج وغم اور فکر وتشویش سے محفوظ ہوگیا۔ سورۃ المزمّل کی آیت ۸/ (واذکر اسمَ ربك و تبتّل اليه تبتيلاً) اور اپنے پروردگار کا نام لے کر اسے یاد کرو اور سب سے کٹ کر بس اسی کی طرف متوجہ ہوجاؤ) کی تفسیر میں صاحبِ ''تدبرِ قرآن'' نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ جو شخص اللہ کو یاد کرتا ہے اور سب سے کٹ کر اللہ رب العزت کی رضا کی خاطر اس کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر لیتا ہے یا خالصۃً اس کی عبادت میں مصروف رہتا ہے وہ رحمتِ الٰہی کی پناہ میں آجاتا ہے اور اپنے کو محفوظ محسوس کرتا ہے (امین احسن اصلاحی، تدبرِ قرآن، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ۹/ ۲۷)۔ ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ اس سوال کے جواب میں کہ اللہ کے بندوں میں کون افضل ہے اور اللہ کے نزدیک مقام کے اعتبار سے کون سب سے بلند ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: الذاكرون الله كثيراً والذٰكرٰت [یعنی اللہ کو خوب یاد کرنے والے مرد اور خوب یاد کرنے والی عورتیں (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الدعوات، باب ذکر اللہ عزّ وجلّ والتقرّب الیہ، دمشق، ۱۹۶۱ء، ۱/ ۶۹۹)۔ ایک دوسری حدیث میں خاص طور سے اجتماعی طور پر ذکرِ الٰہی کے فیوض میں یہ واضح کیا گیا ہے: لا يقعد قوم يذكرون الله عزَّ وجلَّ الّا حفّتهم الملٰئكة و غشيهم الرحمة ونزلت عليهم السكينة و ذكرهم الله فيمن عنده (صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی التلاوۃ وعلی الذکر) [جب بھی لوگ جمع ہوکر اللہ کو یاد کرتے ہیں فرشتے انہیں گھیرے میں لے لیتے ہیں، رحمت ان پر چھا جاتی ہے، ان پر سکینہ کا نزول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے مقربین (فرشتوں) میں ان کا ذکر فرماتا ہے]۔ حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے کچھ نصیحت فرمانے کے لئے عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اوصيكم بتقوى الله فإنّه ازين لامرك كُله [میں تمھیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی نصیحت کرتا ہوں، اس لئے کہ یہ ہر کام کو خوب سنوارنے والا ہے]۔ انہوں نے مزید نصیحت کے لئے خواہش ظاہر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: عليك بتلاوة القرآن و ذكر الله عزَّ و جلَّ كانّه ذكر لكَ فى السماء ونور لكَ فى الارض [قرآن کی تلاوت اور ذکرِ الٰہی کو اپنے اوپر لازم کرلو، یہ آسمان میں تمھارے ذکر کا ذریعہ ہوگا اور زمین میں تمھارے لئے نور ہوگا] (مشکوٰۃ المصابیح [کتاب الآداب، باب حفظ اللسان] یاسر ندیم اینڈ

کمپنی، دیوبند، بدون تاریخ،ص ۴۱۵؛ محمد فاروق خاں، کلامِ نبوت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز،نئی دہلی،۲۰۱۳ء، ۲۰۹/۵)، یعنی ذکرِ الٰہی میں مصروف رہنے والے بندے کا تذکرہ آسمان میں ہوتا ہے اور زمین میں اسے نور نصیب ہوتا ہے جو اسے طرح طرح کی تاریکیوں سے نجات دیتا ہے۔ واقعہ یہ کہ ذکرِ الٰہی سے جو نور میسر آتا ہے وہ صرف ظاہری طور پر کسی ایک گوشہ کو نہیں، بلکہ فکر وعمل کی پوری دنیا کو روشن کرتا ہے اور گناہوں کی تاریکیوں کو دور کرتا ہے۔ یہ حدیث پہلے گذر چکی ہے جس میں صاف صاف مذکور ہے کہ اللہ رب العزت ذاکرین کا تذکرہ ملاءِ اعلیٰ یا فرشتوں کی مجلس میں فرماتا ہے۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ بڑی عزت کا مقام ہے جو ذکرِ الٰہی کے فیض سے نصیب ہوتا ہے۔

ان سب کے علاوہ اللہ کو یاد کرنے سے قلبی سکون میسر آتا ہے۔ یقینی طور پر یہ انتہائی قیمتی و بے بدل نعمت ہے جس کے آگے دنیا کی ساری دولت ہیچ نظر آتی ہے۔ یہ بات ہم سب کے لئے لائقِ توجہ اور ہمیشہ ذہن نشیں رکھنے کی ہے کہ جس ذاتِ عالی نے انسانوں کے دل بنائے ہیں وہی ان دلوں کا مالک بھی ہے، وہ مصرفّ القلوب ہے، جیسے چاہے انہیں پھیر دے۔ اسی نے (بے قراری و بے چینی کے عالم میں) دل کی تسکین کے لئے نسخہ تجویز کیا ہے اور وہ ہے: ذکرِ الٰہی سے دل ودماغ کو سرشار رکھنا اور اطاعتِ الٰہی کا حق بجالانا۔ یہ آیت اسی حقیقت کو منکشف کررہی ہے: الا بذکر اللہ تطمئنّ القلوب (الرعد:۱۳/ ۲۸)[جان لو: اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے]۔ بلا شبہ ذکرِ الٰہی کے فیض سے سکونِ قلب کی صورت میں ایسی بیش بہا نعمت نصیب ہوتی ہے جسے کوئی شخص دولت کا انبار دے کر بھی نہیں حاصل کرسکتا۔ مذکورہ آیت کا پہلا حصہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں اہلِ ایمان کی یہ خاصیت بیان کی گئی ہے کہ انہیں تو اللہ کی یاد ہی سے چین وسکون نصیب ہوتا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے: الّذین آمنوا وتطمئن قلوبھم بذکر اللہ (اہلِ ایمان کے دلوں کو تو اللہ رب العزت کی یاد ہی سے سکون واطمینان نصیب ہوتا ہے)۔ اس آیت کے تفسیری حاشیہ میں مولانا حافظ صلاح الدین یوسف نے بجا تحریر فرمایا ہے کہ اللہ کی عبادت، تلاوتِ قرآن، نوافل اور دعاء ومناجات اہلِ ایمان کے دل کی خوراک ہیں، اس کے بغیر وہ بے قرار رہتے ہیں (تفسیر احسن البیان،ص ۳۳۰، حاشیہ نمبر۔۱)۔ بلا شبہ دل سارے اعضاء کا بادشاہ ہے، جب اسے سکون مل گیا تو دوسرے اعضاء بھی سکون پاگئے اور ٹھیک سے کام کرنے لگے۔ ایک صوفی صفت حکیم نے سورہ الرعد کی مذکورہ بالا آیت کے حوالے سے بجا فرمایا ہے: ''ظاہر سی بات ہے جب جسم کا بادشاہ پُرسکون ہوگا تو اس کے تابع دیگر اعضاء بھی اعتدال سے اپنے امور کو انجام دیں گے'' (دعوۃ الحق، ۱/۱۶، جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۲۰)۔ یہ نکتہ محتاجِ وضاحت نہیں کہ اللہ کو یاد کرنے سے جو سکون میسر آتا ہے اس کا تعلق دنیوی زندگی سے ہے اور آخرت سے بھی۔ اس لئے کہ مومن بندہ ذکرِ الٰہی میں مصروف ہوکر یا دوسری نیکیاں کما کر اللہ کے فضل وکرم کا امیدوار رہتا ہے اور وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ رب العزت کا وعدہ پورا ہوکر رہے گا، یعنی آخرت میں اسے اپنے اعمالِ صالحہ کا بہترین صلہ ملے گا جو اس کے لئے موجبِ راحت وسکون ہوگا۔

یہ بات یقینی ہے کہ مومن کی حقیقی فلاح اخروی زندگی کی کامیابی ہے۔ ایک آیت میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مردوں اور عورتوں کے لئے اللہ نے مغفرت کا سامان اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے: والذٰکرین اللہ کثیراً۔ والذٰکرٰت اعدّ اللہ لھم مغفرۃ وأجراً عظیماً (الاحزاب:۳۳/۳۵)۔ اسی

طرح اوپر سورۃ الجمعۃ کی آیت ۱۰ اور سورۃ الانفال کی آیت ۴۵ کے حوالے سے یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ قرآن کریم نے کثرت سے ذکرِ الٰہی کرنے والوں کو فوز وفلاح کی بشارت سنائی ہے۔

واقعہ یہ کہ ایک مومن کے لئے اس سے بڑی خوش بختی اور کیا ہوگی کہ اسے مغفرت وحقیقی کامیابی کا پروانہ نصیب ہوجائے۔ ان سب کے ساتھ یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ زبان پر برابر ذکرِ الٰہی جاری رکھنے والا، دل میں اللہ کی عظمت وکبریائی کے احساس کو ہمیشہ تازہ رکھنے ولا، ہر قدم اٹھاتے وقت اللہ رب العزت کی مرضی معلوم کرنے والا اور ہر عمل کا ارادہ کرتے ہوئے ربِّ کریم احکام کو یاد رکھنے والا محروم رہ جائے، یہ تصور نہیں کیا جاسکتا۔

اسی کے برخلاف قرآن میں اس پر بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ ذکر الٰہی سے منہ موڑ لیتے ہیں یا اللہ کی یاد سے مستقلاً غافل رہتے ہیں ان کا چین وسکون غارت ہوجاتا ہے، دنیا کی مختصر زندگی میں تو یہ ہوتا ہی ہے، آخرت میں وہ اس بے بدل قیمتی مایہ سے ہمیشہ ہمیش کے لئے محروم رہیں گے۔ اللہ ربّ العزت کا ارشاد ہے: ومن اعرض عن ذکری فإنّ له معیشة ضنکا و نحشره یوم القیٰمة اعمی (طٰہٰ:۲۰/۱۲۴) [اور جو بھی میرے ذکر سے منہ موڑے گا، اس کے لئے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے]۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ کو مودودیؒ اس آیت کی تشریح میں رقم طراز ہیں:

''دنیا میں زندگی تنگ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے تنگ دستی لاحق ہوگی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں اسے چین نصیب نہ ہوگا۔ کروڑ پتی بھی ہوگا تو بے چین رہے گا ہفت اقلیم کا فرماں روا بھی ہوگا تو بے کلی اور بے اطمینانی سے نجات نہ پائے گا۔ اس کی دنیوی کامیابیاں ہزاروں قسم کی ناجائز تدبیروں کا نتیجہ ہوں گی، جن کی وجہ سے اپنے ضمیر سے لے کر گرد وپیش کے پورے اجتماعی ماحول تک ہر چیز کے ساتھ اس کی پیہم کشمکش جاری رہے گی جو اسے کبھی امن واطمینان اور سچی مسرت سے بہرہ مند نہ ہونے دے گی''۔ (تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۷ء، ۳/۱۳۴، حاشیہ نمبر۔۵)۔

مذکورہ بالا آیت کے بعد جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس میں بھی بڑی عبرت کا سامان ہے۔ ارشاد ربّانی ہے: قال ربِّ لِم حشرتنی اعمیٰ وقد کنتُ بصیرا قال کذٰلك اتتكَ آیتنا فنسیتها و کذٰلك الیوم تُنسیٰ (طٰہٰ:۲۰/۱۲۵۔۱۲۶) [وہ (دنیا میں اپنے رب کو بھلا دینے والا) کہے گا: اے میرے پروردگار! میں تو دنیا میں آنکھ والا تھا، یہاں مجھے اندھا کیوں اٹھایا گیا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہاں اسی طرح تم نے ہماری آیات کو جب وہ تیرے پاس آئی تھیں، تم نے بھلا دیا تھا، اسی طرح آج تجھے بھلایا جارہا ہے]، یعنی میری رحمت سے محروم کئے جارہے ہو۔ حقیقت یہ کہ جو لوگ ذکرِ الٰہی سے منہ موڑ لیتے ہیں اور اسی حالت میں پڑے رہتے ہیں، وہ راہِ راست سے بھٹک جاتے ہیں اور فکر وعمل کی کجی کا شکار ہوجاتے ہیں، وہ اس لائق نہیں رہتے کہ ان پر اعتبار کیا جائے اور ان کی بات مانی جائے، اس لئے کہ وہ خود راہِ حق سے منحرف ہوتے ہیں اور جو بھی ان کے نقشِ قدم پر چلے گا وہ بھی بھٹک جائے گا۔ قرآن کریم میں بہت ہی واضح لفظوں میں نبی کریم ﷺ کے توسط سے ایسے لوگوں کے بارے میں پوری امت کو متنبہ کیا گیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذکرنا واتبع هواه وکان امره فرطاً (الکہف:۱۸/۲۸) [اور کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے

اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط وتفریط (عدمِ اعتدال) پر مبنی ہے]۔ واقعہ یہ کہ اللہ کی یاد سے غافل ہو جانے، اس کے بے پایاں احسانات کو بھول جانے اور اس کی ہدایات کو فراموش کر دینے کا وبال تو اصلاً قیامت میں یا روزِ جزا سامنے آئے گا، جیسا کہ سورہ طٰہٰ کی مذکورہ بالا آیت کا آخری حصہ بتا رہا ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے ذکرِ الٰہی سے اعراض کرنے والے اخروی زندگی میں کس کرب واضطراب کی کیفیت میں مبتلا ہوں گے۔ مزید یہ کہ متعدد آیات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب روزِ جزا ان کے اعمال کا نتیجہ سامنے آجائے گا اور انہیں اپنی تباہی وبربادی سامنے کھڑی نظر آئے گی اور وہ انتہائی بے چینی و بے قراری کی کیفیت سے دوچار ہوں گے تو اللہ کی طرف سے ان کے لئے منادی ہوگی: فذوقوا بما نسیتم لقاء یومکم ھذا اِنّا نسینٰکم وذوقوا عذاب الخلد بما کنتم تعملون (السجدۃ:۳۲/۱۴)[پس (اب) عذاب کا مزہ چکھو اس وجہ سے کہ تم نے میرے سامنے آج کے دن کی حاضری کو بھلا دیا تھا، (آج) ہم نے[اپنی رحمت سے] تم کو بھلا دیا ہے، اب ہمیشہ ہمیشہ کا عذاب چکھو اپنے برے کرتوتوں کی سزا میں]۔ ایک دوسرے مقام (الاعراف:۷/۵۰۔۵۱) پر دنیا کی پوری زندگی ذکرِ الٰہی سے غفلت میں گزار دینے والوں کا حشر بڑے عبرت انگیز انداز میں اس طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جب اہلِ جنت و اہلِ جہنم اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ اللہ کی مرضی سے دونوں کے درمیان کے حجابات اٹھا دئے جائیں گے اور وہ ایک دوسرے سے بات چیت کر سکیں گے۔ جہنمی اہلِ جنت سے کہیں گے: 'ہمیں جنت کے پانی سے فیض پہنچایئے اور اللہ کی عنایت کردہ نعمتوں میں سے کچھ ہمیں بھی عنایت کیجیے'، جواب میں جنّتی کہیں گے کہ آج اللہ نے ان نعمتوں کو کافروں پر حرام قرار دے دیا ہے، جنہوں نے اپنے دین کو لہب ولعب کا سامان بنا دیا تھا اور جنہیں دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا تھا، [یہاں تک کہ وہ اللہ کو یاد کرنا اور اس یاد کے تقاضے پورے کرنا بھول گئے تھے]۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا: فالیوم ننسٰھم کما نسوا لقاء یومھم ھٰذا و ما کانوا بآیٰتنا یجھدون (الاعراف:۷/۵۱)[آج ہم بھی انہیں اسی طرح بھلا دیں گے (یعنی اپنی رحمت سے دور کر دیں گے) جس طرح وہ آج کی ملاقات (یعنی یومِ جزا ہمارے حضور پیشی) کو بھولے رہے اور ہماری آیات کا انکار کرتے رہے (یعنی آج کے دن کی فکر و تیاری سے بالکل غافل ہو کر زندگی گذارتے رہے)۔

مزید یہ کہ قرآن نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے انسان اپنے رب کو کیوں بھول جاتا ہے، اس کی ہدایات کو، اس کے رسول کی باتوں سے کیوں غافل رہتا ہے؟ قرآن کے مطابق یہ صورتِ حال انسان پر شیطان کے غالب آجانے یا اس کے اندر کے سب سے بڑے شیطان (نفس) کے بہکاوے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ذکرِ الٰہی سے مسلسل اعراض اور اس کے نتیجہ میں بدعملی کا شکار ہو کر آخری انجام کو برباد کر دینے والوں کے بارے میں ارشادِ ربّانی ہے: استحوذ علیھم الشیطٰن فانسٰھم ذکر اللہ الا اِنّ حزب الشیطٰن ھم الخٰسرون (المجادلۃ:۵۸/۱۹)[شیطان ان پر مسلّط ہو چکا ہے اور اس نے اللہ کی یاد ان کے دل سے بھلا دی ہے، وہ شیطان کے گروہ کے لوگ ہیں، ہوشیار جاؤ، شیطان کے گروہ والے (ہمیشہ ہمیش کے) خسارے میں رہنے والے ہیں]۔ قرآن کی ایک اور آیت سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مال و اولاد کی بے جا محبت میں گرفتار ہو کر انسان اللہ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے اور اس کے حکموں کو

بھول جاتا ہے اور یہ کیفیت (جو شیطان یا نفس کے ورغلانے کے اثر سے پیدا ہوتی ہے) اس کے لئے بڑے خسارے کا باعث بنتی ہے۔ اہلِ ایمان کو متنبہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یاایھا الّذین آمنوا لا تلھکم اموالکم و لا اولادکم عن ذکر اللہ و من یفعل ذٰلك فاولٰئك ھم الخٰسرون (المنٰفقون:۶۳/۹)[اے ایمان والو! تمھارے مال و اولاد تمھیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کردیں، جو بھی ایسا کریں گے وہ بڑے خسارے میں ہوں گے]۔ قرآن میں اسی لئے انسان کو بار بار خبردار کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اندر ذکرِ الٰہی سے غفلت یا اللہ کو بھلا دینے کی کیفیت نہ پیدا ہونے دے اور خُدا فراموش لوگوں کی روش پر نہ جا پڑے اور کسی بھی حالت میں اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو جائے۔ ارشاد ربّانی ہے: و لا تکونوا کالّذین نسوا اللہ فا نسٰھم انفسھم اولٰئك ھم الفٰسقون (الحشر:۵۹/۱۹)[اور ان لوگوں کی طرح نہ ہوجاؤ جو اللہ کو بھول گئے، تو اللہ نے انہیں خود اپنے آپ کو بھلوادیا، یہ لوگ گنہ گار ہیں]۔ بلا شبہ جو اپنے آپ کو فراموش کردے، اس کی زندگی کس رخ پر جائے گی، کچھ پتہ نہیں، وہ انتہائی غفلت و بے خبری کے عالم میں کیا کچھ کر جائے اور اپنی تباہی کا سامان مول لائے، خود اس کو خبر نہیں ہوگی۔

مختصر یہ کہ ذکرِ الٰہی سے اہلِ ایمان کے دل کو تقویت، ذہن کو سکون اور عمل کو پاکیزگی نصیب ہوتی ہے۔ بلا شبہ کہ ذکرِ الٰہی اپنے ساتھ بے پناہ فیوض و برکات ساتھ لاتا ہے۔ قرآن و حدیث سے یہی واضح ہوتا ہے کہ ذکرِ الٰہی مومنین کی روحانی غذا ہے، قربتِ الٰہی کی طلب کا نہایت اہم وسیلہ ہے، ربِّ کریم سے تعلق مضبوط کرنے اور اس کی نصرت و تائید طلب کرنے کا انتہائی موثر ذریعہ ہے۔ وہ کسی لمحہ اس سے غافل نہیں رہ سکتے، اس لئے کہ اسی سے انہیں سکونِ قلب نصیب ہوتا ہے، اس کے بغیر کسی اور چیز سے انہیں چین و قرار مل ہی نہیں سکتا۔ ذکرِ الٰہی روزمرہ زندگی میں مومن کا ہر وقت کا وظیفہ ہے۔ یہ ایسا محبوب مستقل مشغلہ ہے جو نماز اور دوسری فرض عبادات سے قبل، ان کی ادائیگی کے دوران اور اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے، نہ تو معاشی تگ و دو اس میں حارج بنتی ہے اور نہ جنگ کے دوران کی بے اطمینانی و خوف کی صورتِ حال اس میں مانع آتی ہے۔ واقعہ یہ کہ ذکرِ الٰہی نہ تو وقت و مقام کا پابند ہے اور نہ ہی اس کے لئے انسانی زندگی میں حالات کی تبدیلی کی قید و بند ہے۔ واقعہ یہ کہ ذکرِ الٰہی اہلِ ایمان کا محبوب نغمہ ہے جو ہر وقت اور ہر صورتِ حال میں ان کی زبانوں پر جاری رہتا ہے اور ہمیشہ ان کے دل و دماغ میں سمایا رہتا ہے۔ کیا خوب کہا ہے نامور مفکرِ اسلام علامہ محمد اقبال نے:

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں ، لاالٰہ الاّ اللہ

اس تحریر کا خاتمہ اس دعاء پر زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے جسے نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذؓ کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہتے ہوئے سکھائی تھی کہ اے معاذ! میں تجھ سے محبت کرتا ہوں، اے معاذ میں تجھے تاکید کرتا ہوں کہ کسی بھی نماز کے بعد یہ کلمات ادا کرنا ترک نہ کرنا: **اللھمّ اعنّی علیٰ ذکرك و شکرك و حسنِ عبادتك** (سنن ابوداؤد، کتاب الوتر، باب الاستغفار) [اے اللہ اپنا ذکر کرنے و اپنا شکر ادا کرنے اور احسن طریقے سے اپنی عبادت کرنے پر میری مدد فرما، یعنی مجھے ان کی توفیق عنایت فرما]۔ اللہ رب العزت ہماری دعاؤں کو قبول فرمائے، ذکرِ الٰہی کو ہمارا محبوب مشغلہ بنادے اور اس کے نور سے ہمارے فکر و عمل کی دنیا کو منور کردے۔ ربّنا تقبّل منّا انّكَ انت السمیع العلیم ۔ آمین ثم آمین۔

☆☆☆

❑ احوالِ وطن

ہندوستان کی قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰
تعارف، خطرات اور راہ عمل

ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی
صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز
مانو، حیدرآباد

تعارف

آیئے! ہم تعلیمی پالیسی 2020 پر بات کرتے ہیں، اور دیکھتے ہیں کہ ہم کہاں اس سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں، کن جگہوں پر بیدار رہنے کی ضرورت ہے، اور اپنے کن سرمایوں اور خزانوں سے محرومی کا خدشہ ہوسکتا ہے۔ یہ پالیسی بہت تفصیلی ہے، اور ہر منصوبہ کی طرح اس میں بھی کئی اچھائیاں، کئی الجھاوے، اور کئی مخصوص پسند کی تبدیلیاں ہیں۔ بچوں کی تعلیم بے حد اہمیت رکھتی ہے، اس پالیسی میں یہاں دورانیہ کا پورا ڈھانچہ بدلا ہے، مضامین میں کھلا پن اور صلاحیت پر توجہ دی گئی ہے، امتحان کا بوجھ اتارا گیا، اور کوچنگ کلچر کو دور کیا گیا ہے، مادری زبانوں کو اہمیت ملی ہے، لیکن سنسکرت کو سر پر سجاتے ہوئے عربی سے بے رخی برتی گئی ہے، اور ہندوستانی تہذیب اور کردار کو پورے ڈھانچہ اور سانچہ میں روح کی طرح جاری بنایا گیا ہے، اور ہندوستانیت کی تشریح زعفرانی رنگ میں لائی گئی ہے۔ مانوس طریقہ اور ڈھانچہ میں تبدیلی فطری بھی ہوتی ہے، یہ کسی حد تک اچھی بھی ہوسکتی ہے، آئین نو طرز کہن کو بدلتا رہتا ہے، سو بدل رہا ہے۔ زبان کا مسئلہ بے حد اہم ہے، یہ قوم کو ماضی، سرمایہ، اور جڑ سے جوڑتی یا کاٹ دیتی ہے، تو اسے بچائے رکھنا فرض ہوجاتا ہے۔ ہندوستانیت ملک کی مشترکہ ثقافت ہے، ماضی بعید تو تاریخ ہے، دور وسطی ملک کی شان اور عزت وخوشحالی ہے، اور دور جدید تاریخ کا تسلسل ہے، سب کے ملنے سے تہذیب بنی ہے، وہی ہندوستانیت ہے۔ لیکن یہ منظر یہاں مفقود ہے، تو یہ تشریح محنت اور عزم کے ساتھ کرنی ہوگی، اور آنے والی نسلوں کو عزت کی زندگی اور ملت سے وابستگی دینی ہوگی۔

اسکول کی تعلیم:

اس پالیسی کے لحاظ سے اسکول کی تعلیم اب پندرہ سال ہوگی۔ تین سال آنگن واڑی، اس کے بعد دو سال اول دوم۔ یہ پانچ سالہ فاؤنڈیشن کہلایا۔ سوم، چہارم، پنجم، یہ تین سال تیاری والے کہلائے۔ ششم، ہفتم، ہشتم، یہ تین سال مڈل کہلائے۔ اور اب ایک ساتھ چار سال: نہم، دہم، گیارہویں، بارہویں، سکنڈری نام پائے۔ تو یہ پندرہ سال کی اسکولی تعلیم ہوگی۔ اس کا نیا نام ہوا: 4+3+3+5۔

قدیم سے ملائیں تو درجہ اول سے قبل کے تین سال یعنی نرسری، کے جی فرسٹ، کے جی سکنڈ، کو باضابطہ تعلیم میں شامل کرلیا گیا ہے۔ قدیم میں چھ سال کی عمر کلاس اول کی تھی، تو اب

بھی یہی ہے، کہ اب آنگن واڑی کے تین سال کا کورس تین سال کی عمر سے شروع ہوگا۔ تو اب بھی اٹھارہ سال کی عمر میں بارہویں کی تکمیل ہوگی۔اندیشہ ہے کہ لازمی حق تعلیم قانون 2009 کی طرح اب تین سال کی ہی عمر سے آنگن واڑی تعلیم لازمی بنادی جائے۔آنگن واڑی کے تین سال،اوراول ودوم کلاسز میں تعلیم کے مضامین تربیت کے ٹھوس نقوش بن جائیں گے،تواس پالیسی میں ان پر اپنی پسند کی گہری چھاپ ڈالی گئی ہے۔ان اساتذہ کوخاص انداز سے چھ ماہ اورایک سال کی تربیت دی جائے گی۔ان کے پاس اپنی تعلیم بھی برائے نام ہوگی۔ اس تعلیمی دورانیہ کو ECCE کے نام سے اہمیت اور تیاری کے ساتھ لایا گیا ہے،تعلیم سے زیادہ خاص ہندوستانیت کے لباس میں تربیت پر بھرپورتوجہ رکھی گئی ہے۔اس میں اسکول سے باہر کے افراد بھی پڑھانے اور سکھانے کیلئے آئیں گے۔ توان امور میں سے ہرنکتہ پرغورکرنے کی سخت ضرورت ہے۔فاؤنڈیشن کے ان پانچ سالوں میں مادری اور علاقائی زبان میں تعلیم ہوگی۔آگے کے تین سالوں میں بھی کلاس پنجم تک اسی کوترجیح دی جائے گی۔اوراس سے آگے یعنی کلاس ششم سے سہ لسانی فارمولہ اس طرح چلے گا کہ دو زبانیں ہندوستانی ہی رہ سکیں گی۔اورسنسکرت زبان اپنے بے شمارفضائل کے ساتھ یہاں سے اعلی تعلیم تک ساتھ ساتھ رہے گی۔روایتی مضامین کے ساتھ ان میں گاؤں کے پیشے، ہنر، تجربے، ناچ گانے،اورزیادہ سے زیادہ پراچین کال کی چیزیں بھی داخل رہیں گی۔قدیم بھارت عہدوسطی کوپھلانگ کرجدید بھارت سے مل جائے گا،اورعالمی گاؤں کیلئے قدیم بھارت کی اچھائیوں کو درشایا جائے گا۔سکنڈری تعلیم میں مضامین کی الگ الگ راہیں نہ ہوں گی، یعنی سائنس پیشے وحرفے سے،اورسماجیات وریاضیات فنون لطیفہ سے گلے مل رہے ہوں گے۔امتحانات یادکرکے نہیں، سمجھ کردیئے جائیں گے۔اور پاس ہونے کی راہیں کھلی رہیں گی۔تواس طرح یہ دستاویز پاؤں کے ناخن سے سر کے بال تک بدلا وٴپیش کررہا ہے، نام بھی الگ، ادارے بھی الگ،تصور بھی الگ،دورانیہ بھی الگ۔تو بہت کچھ الگ ہے،اوریہی اس پالیسی کا کمال ہے۔

اعلی تعلیم:

ملک میں اس سے قبل دو تعلیمی پالیسی 1968اور 1986 میں آئی تھیں۔ 1992 میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ ان سے ہٹ کر وقتاً فوقتاً بھی قوانین اورضوابط نافذ ہوتے رہے۔اوراب تعلیمی پالیسی 2020 آئی ہے۔نئی پالیسی پچھلی پالیسیوں کا تسلسل ہوتی ہے، اور سابق اہداف کے تجربات کا جائزہ لیتے ہوئے نئی راہیں اوراہداف طے ہوتے ہیں۔لیکن یہ تذکرہ اس پالیسی میں تقریباً مفقود ہے۔فاؤنڈیشن، پریپیر یٹری، مڈل، اور سکنڈری تک 18 سال کی عمر میں بارہویں مکمل ہونے کے بعد،گریجویشن کی تعلیم تین سالہ اور چار سالہ ہے۔چوتھا سال ریسرچ کی تعلیم کیلئے ہے،جس کے بعد ایم اے یا پوسٹ گریجویشن صرف ایک سال کا ہوگا۔اورتین سال کی صورت میں ایم اے دوسالہ کرنا ہوگا۔ایم اے کے بعد پی ایچ ڈی ہوگی، ایم فل ختم ہوجائے گا۔گریجویشن کی تعلیم نامکمل چھوڑنے والوں کو بھی اسناد دی جائیں گی۔صرف ایک سال پر سرٹیفیکٹ، اور دو سال پر ڈپلومہ کی سند دے کر رخصت کردیا جائے گا۔اورادھوری تعلیم کے بعدان کی پونجی یعنی کریڈٹس بنک میں محفوظ رکھ کر اپنی سہولت سے بعد میں اسے آگے پورا کیا جاسکے گا۔ایک مضمون کے تعلیمی اداروں پر بندش ہوگی۔ لہٰذا میڈیکل، مینجمنٹ، انجینئرنگ اور قانون کے اداروں میں بھی سماجی علوم وغیرہ پڑھائے جائیں گے۔ ایسے ہی کالج کھولے جائیں گے جہاں مختلف اور متعدد مضامین کی تعلیم ہوگی۔تعلیمی ادارے بورڈ آف گورنرس یعنی منتظمہ کمیٹی بااختیار ہوکر چلائے گی۔وہی کمیٹی اساتذہ کی تقرری، داخلے اورفیس وغیرہ کے فیصلے کرے گی۔اعلی تعلیم کے مضامین میں ہندوستانی ثقافت، اور علاقائی و دیہی زبان وغیرہ کے ساتھ سنسکرت، یوگا اور پراچین

بھارت کی بہت سی چیزوں کو شامل کیا جائے گا۔ غیر ملکی اعلی تعلیمی ادارے ملک میں آئیں گے، اور مذکور طریقہ پر تعلیم چلائیں گے۔ پرائیوٹ اداروں کی ہمت افزائی کی جائے گی، اور وہ اسکالرشپ دیں گے، اس طرح ان کا کنٹرول بڑھے گا۔ ریسرچ کے انتظامات کیلئے ایک نیا ادارہ بنے گا۔ قانون اور میڈیکل کے علاوہ دیگر تعلیم کیلئے موجودہ الگ الگ انتظامی اداروں کی جگہ اب ایک ہی ادارہ رہے گا، یعنی ٹیکنیکل، فاصلاتی اور روایتی تعلیم کا نظم دیکھنے کے الگ الگ ادارے باقی نہ رہیں گے۔ اور تعلیم پر خرچ کرنے کیلئے ملکی بجٹ سے جی ڈی پی کا 6 فیصد خاص کیا جائے گا۔ تو یہ چند مزید باتیں تھیں۔ ان باتوں اور ان کی تہوں پر غور کرنے سے بہت کچھ سامنے آئے گا۔

عوامی رابطہ:

ملک کی نئی تعلیمی پالیسی 2020 ایک پالیسی یعنی ایک منصوبہ، تصور اور سوچ ہے، اس میں اہداف ہیں، اور ان کو حاصل کرنے کی راہیں دکھائی گئی ہیں۔ خود یہ قانون نہیں ہے۔ اس منصوبہ کی روشنی میں قوانین بنیں گے، فیصلے ہوں گے، ادارے بنائے جائیں گے، اور اقدامات کئے جائیں گے۔ اس کا آغاز ہو بھی چکا ہے، مثلاً اب اس وزارت کا نام فروغ انسانی وسائل MHRD کی جگہ وزارت تعلیم MoE ہو گیا ہے۔ یہ منصوبہ جب مجوزہ مسودہ بن کر آیا تھا، تب عام لوگوں سے رائیں اور مشورے مانگے گئے تھے، کافی لوگوں نے تجاویز بھیجی تھیں، مسلم تنظیموں، اداروں اور افراد نے بھی اپنی میٹنگیں، پروگرام اور مباحثے کر کے اچھی تجاویز ارسال کی تھیں۔ اس منصوبہ کو منظوری سے پہلے پھر بحث اور غور کیلئے سامنے لایا جانا چاہئے تھا۔ تب کھل کر سامنے آتا کہ کن تجاویز کو قبول کیا گیا ہے، اور کن مشوروں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور کیوں؟ یہ بھی معلوم ہوتا کہ اب اس میں کہاں کہاں اور کیا کیا خامیاں ہیں؟؟ لیکن ایسا نہیں کیا گیا، اور اسے کیبینٹ سے منظور کر لیا گیا۔ ماہرین کے مطابق کئی مشورے قبول کئے گئے ہیں، مثلاً ہندی میڈیم میں لازمی تعلیم ہٹالی گئی ہے، لیکن گھما کر وہ بات مادری زبان یا علاقائی زبان میں تعلیم دینے کی کہی گئی ہے، البتہ 'جہاں ممکن ہو' کا لفظ لایا گیا ہے۔ لیکن بہت سی کمیاں اس میں موجود ہیں۔ اور سب سے اہم یہ کہ بہت سی باتیں واضح نہیں کی گئی ہیں، مبہم باتوں نے شکوک اور سوالات پیدا کر دیئے ہیں۔ اس منصوبہ میں کئی باتیں مفید ہیں، اور ان سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ ہم بھی ان سے فائدہ کا ذہن بنا سکتے ہیں۔ مثلا اسکول میں مادری زبان میں تعلیم بچوں کیلئے تعلیم کو سہل بنائے گی، تو شاید ہم اردو کو مضبوط کر سکتے ہیں۔ آنگن واڑی تعلیم میں گاؤں اور دیہی علاقوں کے چھوٹے بچوں کو ابتدائی تربیت اور صحت و غذا سے جوڑا جا سکتا ہے، اس میں مقامی افراد کے ذریعہ رہنمائی اور تعاون کا نظام بنایا جا سکتا ہے۔ مڈل اور سیکنڈری سطح میں فارن لینگویج کے تحت عربی زبان کی تعلیم اپنانے کی صورت پر غور کیا جانا چاہئے۔ اس مرحلہ میں ہنر اور پیشیوں کی تعلیم دی جائے گی، تو اس سے بچوں کو آراستہ کر کے آئندہ کاروبار کی راہیں بنائی جا سکتی ہیں۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی ہوگی کہ تعلیم ہی ترقی اور سمجھ کی کنجی ہے، اور تعلیم دنیا میں بامقصد زندگی گذارنے کیلئے ہے۔ تو اسکول سے لے کر اعلی تعلیم تک میں جتنی سہولیات آئیں گی وہ سب کیلئے مفید ہوں گی۔ محنت، ذہانت اور قابلیت پر کسی دوسرے کا کنٹرول نہیں ہے، اور قابلیت کو سراہنے پر دنیا مجبور ہے۔ ہم عہد اور کوشش کریں کہ ہر فرد کی تعلیم اور ہر گھر کی تعلیم ہو، مکمل اور معیاری تعلیم ہو، اور آگے بڑھ کر امکانات سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

ملت کا تناظر:

اس وقت جدید تعلیمی پالیسی سے متعلق باتیں اور رائیں سامنے آرہی ہیں۔ ملت کے تناظر میں اس پر متوازن انداز سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس پالیسی کا مطالعہ دو رخ سے کیا جائے گا۔ ایک یہ کہ ملک کا تعلیمی ڈھانچہ اب کدھر جا رہا ہے، اور وہ کہاں تک ملک کی مجموعی ترقی کیلئے مفید ہے۔ دوسرا رخ یہ ہوگا کہ ملت مسلمہ

کیلئے اس پالیسی سے کیا امکانات اور خدشات وابستہ ہیں۔ دونوں رخ سے مطالعہ ہماری ذمہ داری اور ہماری حصہ داری ہے۔ یہاں ہماری بات دوسرے رخ سے زیادہ متعلق ہے، کہ اختصار کے موقع پر یہی ضروری ہے۔ مفید امکانات کے کچھ پہلو بیان کئے جا چکے ہیں۔ اب کچھ اشارے خدشات کی جانب کئے جاتے ہیں۔

تاریخ کسی قوم کا سرمایہ ہوتی ہے، اور وہی مستقبل کیلئے مہمیز بھی کرتی ہے، اور وہی پست ہمت اور نابود بھی کر دیتی ہے۔ ملک میں ہزار برس کی شاندار مسلم تاریخ نے ملک کو متحد، محفوظ، مضبوط، تمدنی ورثہ سے مالا مال اور سونے کی چڑیا بنایا۔ یہ پوری تاریخ اب غائب ہی نہیں کلنک کا داغ بنائی جائے گی۔ پراچین بھارت کے بعد صرف موجودہ بھارت ہے، درمیان کی تاریخ کا ذکر نہیں ہے۔ یورپ نے بھی یونانی عہد کے بعد نشات ثانیہ میں چھلانگ لگائی تھی اور علوم وافکار وتمدن کی منتقلی، ترقی اور ایجادات کے حیرت انگیز مسلم دور پر پردہ ڈال دیا تھا، تو موجودہ یورپ اور مغرب نیز جدید دنیا مسلم حصہ داری سے مجرمانہ اور تجاہلانہ غافل بنی ہوئی ہے۔ ملک کی بابت یہ خدشہ اس پالیسی سے منظّم ہو کر سامنے آیا ہے۔

تعلیم انسان کو اقدار سے آراستہ کرتی ہے، اور بیشتر اقدار مذاہب کا مشترکہ سرمایہ ہوتے ہیں، کچھ اقدار مخصوص مذہبی رنگ رکھتی ہیں۔ اس پالیسی میں کھلے طور پر ان دونوں طرح کی اقدار کو زعفرانی رنگ دے دیا گیا ہے، مشترک اقدار کو بھی ایک مذہبی اصطلاح کا لباس پہنا دیا گیا ہے۔ مذہبی رنگ میں اصطلاحات کی کثرت تو کبھی قاری کو حیران بھی کر دیتی ہے کہ یہ کسی تکثیری سماج کا منصوبہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تو کھل کر اس کا اظہار بہت کچھ کھل کر بتا رہا ہے۔ افراد ملت کی عقائدی اور تہذیبی شناخت ان کے وجود کا جوہری عنصر ہے، اس کی بقا سنجیدہ سوچ کی متقاضی ہے۔ یہ رنگ بچپن کی ابتدائی تربیت اور تعلیم کے رگ رگ میں بھرنے کی کوشش صاف طور پر پالیسی میں ہے۔ اعلی تعلیم میں اس رنگ کی ہر طرح ہمت افزائی کی جائے گی۔ سنسکرت، یوگا، مذہبی ثقافت اور پراچین بھارت کی عظمت، تعلیم اور ریسرچ کے سنہرے موضوعات ہوں گے، تو افراد ملت کو ان میں اپنے سرمایہ سے وابستہ رہنے کی راہیں ڈھونڈنی ہوگی۔ تعلیم کو سستا بنانے کی بات تو کی گئی ہے، لیکن نجی اداروں کی حوصلہ افزائی اور بیرونی اداروں کی آمد نیز موجودہ سماج کی ذہنیت کو سامنے رکھتے ہوئے تعلیم کے مزید مہنگی ہونے کا قوی امکان ہے، جس سے غریب سماج کی تعلیم مزید دشوار ہوگی، اور تعلیم سے دوری تباہی پر مہر لگا دے گی۔ تو اس میں سب کی تعلیم اور اچھی تعلیم کا منصوبہ لانا ہوگا۔ اس پالیسی کے لحاظ سے تعلیم کے نظم وانتظام کو مرکزی کنٹرول میں دیا جا رہا ہے، اور وہاں بھی فیصلہ اور قوت کا ارتکاز کیا جا رہا ہے، تو مخفی اور کھلے عزائم شدت سے نافذ ہوں گے۔ مسلم زیر انتظام تعلیمی اداروں پر بھی نگرانی اور ان سے پابندی کرانے میں شدت پیدا کی جائے گی۔ تو وہ اپنے دستوری تحفظات اور اختیارات کس طرح استعمال کر سکیں گے، اس پر پیش بینی کی ضرورت ہوگی۔

اب دو باتیں ذہن میں تازہ رکھئے: پالیسی کی رخ بندی کافی واضح ہے، تو اس کے خدشات بلکہ نقصانات پر ملت کے افراد کو سنجیدہ اور متحدہ موقف طے کرنا چاہئے، اور پوری قوت کے ساتھ ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔ دوسرے یہ کہ وقت کی رفتار کو بھانپتے ہوئے جہاں جہاں امکانات موجود ہیں، ان میں نئی راہیں نکالنے پر غور اور عمل کی بھی منصوبہ بندی کرنی چاہئے۔

نئی تعلیمی پالیسی 2020 کی چند باتیں بہت نمایاں ہیں۔ اس کو تیار کرنے والی سرکار کے عزائم واضح ہیں۔ آر ایس ایس کی ساٹھ فیصد تجاویز شامل کر لی گئی ہیں۔ اس پالیسی کو منظوری کیلئے مباحثہ میں نہیں پیش کیا گیا۔ اس کا اصل منظور کردہ مسودہ سامنے لانے کے بجائے ایک مختصر مسودہ لوگوں میں ڈال دیا گیا ہے کہ اسی میں سب الجھے رہیں۔ پالیسی میں درج ہے کہ اس کا مقصد پراچین بھارت کی سنسکرتی، طور طریقے، تعلیم،

شخصیات، اور کارنامے نئی نسل کو پڑھانا ہے۔ تو آنگن واڑی کے مرحلہ میں ہی چھ ماہ/ایک سال کی خصوصی تربیت والے اساتذہ کے ذریعہ کچی عمر کے بچوں کو اس رخ اور راہ پر ڈالا جائے گا، اس میں رضا کاروں سے بھی تعاون لیا جائے گا، یعنی ان کے کارندے یہاں قانونی دخل انداز ہوں گے۔ ابتدا سے اعلی تعلیم اور ریسرچ تک اسی طرح کے مضامین کی ہمت افزائی ہوگی، اور کچھ مضامین لازمی بنیں گے۔ سرکار کا اندازِ کار بزور اور بہ دھوکہ اپنے منصوبے نافذ کرنا رہا ہے، اور اپنی تائید کیلئے افراد خریدے، ڈرائے اور لبھائے جاتے رہے ہیں۔ تو وہ سب اس پالیسی پر عمل کرانے میں ہوگا۔ نجی اداروں اور بیرونی اداروں کیلئے آسانیاں پیدا کی گئی ہیں، تو ان کے یہاں تعلیم مہنگی رہی ہے اور رہے گی، اور معاشی طور پر کمزور افراد تعلیم سے محروم ہوں گے۔ ملک کی بڑھتی تعلیمی ضرورت سرکار نہیں پوری کرے گی، بلکہ نجی ادارے کریں گے تو جس ملک اور قوم میں تعلیمی پسماندگی ہے وہاں ناخواندگی بے تحاشا بڑھے گی۔ تعلیمی اداروں کی منظوری اور نگرانی پر مرکز کی گرفت سخت کی گئی ہے اور وہ وزیر اعظم کے تحت لائی گئی ہے، تو اس منشا کو پورا کرنے والے ہی تعلیمی ادارے چلا سکیں گے۔ پالیسی میں دعوے بلند بانگ کئے گئے ہیں کہ صرف انہی الفاظ کو سننے والے خوش ہو جائیں۔ ساتھ میں وہ باتیں بھی لکھ دی گئی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔ بہت سی جگہوں پر ابہام اور الجھاؤ چھوڑ دیا گیا ہے جہاں مزید خدشات اٹھتے ہیں۔ تصورات میں تضادات کی صورت ہے، اور پراچین بھارت اور ایک مذہب کی اصطلاحات کثرت سے لائی گئی ہیں۔

اب ان باتوں کے بعد ہم ملت مسلمہ کے سامنے چند قابل فکر باتیں ہیں۔ یہ صورت حال غیر متوقع نہیں ہے، ہماری نسل کے باحوصلہ مرد وخواتین اس کیلئے بیدار اور ذہنی طور پر تیار ہیں۔ تاریخ ایسے ہی بنتی ہے، اور محنت وحوصلہ اور متحدہ کوشش کامیابی لاتی ہی ہے۔ تو ہم مایوس نہیں پرعزم ہیں۔ ہمارے سامنے تعلیم کے تین میدان ہیں: دینی مدارس کی تعلیم، مسلم زیر انتظام اداروں میں تعلیم، اور عام نجی وسرکاری اداروں میں تعلیم۔ ان تینوں میدانوں کیلئے منصوبہ بندی کچھ سابق تجربہ اور کچھ موجودہ امکانات کی روشنی میں کرنی ہے۔ یہ راستے بند نہیں ہیں، اور اچھی منصوبہ بندی کے امکانات موجود ہیں۔ دستوری قانونی حقوق کے تحت ہمیں ملک میں سب کی تعلیم اور اچھی تعلیم کے نعرہ کے ساتھ کچھ مطالبات کرنے ہوں گے، اور مضبوط ومتحدہ موقف پر اصرار کرنا ہوگا۔ یہ دو طرح کے ہوں گے: سب کے لئے سستی اور اعلی تعلیم پر مبنی مطالبات، اور اقلیتوں کو اپنی پسند کی مذہبی ولسانی تعلیم پر مبنی مطالبات۔ اور سب سے اہم یہ ہے کہ موجودہ امکانات کے تحت کثرت سے اور ہر سطح کے تعلیمی اداروں کا قیام کیا جائے۔ اس کیلئے افراد، وسائل، سوچ، اور جذبہ سب موجود ہیں۔ ان کو یکجا کرنے کا وقت آیا ہوا ہے۔ ہم یاد رکھیں کہ اب وقت بدلا ہوا ہے، دنیا ہی بدلی ہوئی ہے، پہلے بھی وقت بدلا کیا ہے، یہی قانون قدرت بھی ہے، تو ذہن کے دروازے زیادہ کھول لیں، قدیم کی عظمت واحترام کے ساتھ نیا جلد اپنا لیں، دینی روح اور شرعی اصولوں کی بنیاد پر نیا نظام، نصاب اور نہج طے کر لیں۔

پالیسی کے متوقع نتائج:

ملکی دستور میں سب کیلئے تعلیم اور سائنسی ذہن پیدا کرنے کی بات بے انتہا اہم رکھی گئی ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی 2020 میں کئی جگہ الفاظ تو یہی لائے گئے ہیں، لیکن پالیسی کی پوری تفصیل اس کے خلاف ہے۔ اور یہی اس پالیسی کی پہچان ہے، یعنی دعوے کچھ اور کام دیگر۔ دیو مالائی کہانیوں اور تاریخ میں گم مذہبی اصطلاحوں اور پراچین کال کی بھول بھلیوں میں واپس لے جانے سے کیا سائنس کی موجودہ ترقیوں سے ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے؟ کجا کہ سائنسی جستجو اور تردید وتنقید کا ذہن بنے۔ جدید اصلاحی اور تعلیمی تحریکات، اور بھارت کی تعمیر کرنے والے عہد وسطی اور عہد جدید کے ہمارے آدرش پرشوں کے

نظریات کو پڑھے بغیر تعلیمی ترقی کا کون سا ذہن تشکیل پاسکتا ہے؟ خیالات کی آزادی اور جمہوری روح کی پرورش کیا جدید دنیا کو پڑھے بغیر بھی کی جاسکتی ہے؟ موجودہ پالیسی ان تصورات کو بری طرح مجروح کررہی ہے۔غریبی سے جوجھ رہے اس ملک میں موجودہ مہاماری کی خطرناک غربت کے موقع پر بھی سرکار نے تعلیم کی ذمہ داری اٹھانے سے ادائے معشوقانہ کے انداز میں پلہ جھاڑ لیا ہے۔

غور کیجئے! آنگن واڑی میں تین سال کی تعلیم کیلئے وہی دسویں تعلیم والے اساتذہ ہوں گے، رضاکاروں کی مدد لی جائے گی،اور ساتھی طلبہ ایک دوسرے کو پڑھائیں گے۔تو نئے اور ماہر اساتذہ کی ضرورت ختم ہوگئی۔اور ایسے اساتذہ کو نوکری بھی نہیں مل پائے گی۔اسکول اپنے وسائل ایک دوسرے سے بانٹیں گے، تو گویا ہر جگہ اسکول کی ضروریات پوری نہیں کی جائیں گی۔اور بچے کچھ تعلیم یا اکٹیویٹی کیلئے اپنے اسکول سے دور کے دوسرے اسکول جانے پر مجبور ہوں گے۔تو ان کی تعلیم خراب ہوگی۔اور اس پر پردہ ڈالنے کیلئے اب تعلیمی مضامین کے برابر ہی دوسری چیزیں جیسے کھیل کود، ڈانس، فلم بنی اور صحت وغیرہ رپورٹ کارڈ میں شامل کرکے اچھا نتیجہ دکھایا جائے گا،خواہ بچے اصل مضامین میں بودے ہوجارہے ہوں۔ آگے بھی ایسے بچوں کو امتحان کا خوف نہیں رہے گا۔تو تعلیمی قابلیت کا ستیاناس مزیدار طریقہ پر کیا جاتا رہے گا۔یہ بچے کون ہوں گے؟ وہی غریب کمزور اور چھوٹی ذاتوں واقلیتوں کے بچے جن کی اکثریت ہے۔پرائیوٹ تعلیمی اداروں کو ترغیب دی گئی ہے، مال دار گھرانوں کو اس کیلئے قانون حق تعلیم جس میں تعلیم کے معیارات اور وسائل پر سختی رکھی گئی تھی، اس میں ڈھیلا پن لانے کا یقین دلایا گیا ہے۔اسکول کے انتظام اور اساتذہ کی تقرری ان کی مرضی کے مطابق ہوگی،تو ایسی صورت میں یہاں صرف خوشحال افراد کی تعلیم ہوسکے گی۔

اعلی تعلیم کو تو اس طرح زک اور زد پہنچایا جارہا ہے کہ پھر کوئی آہ بھی نہ کرسکے،اور ان کی نسلیں غلامی میں چلی جائیں۔ اس پالیسی کے مطابق اب جو افراد اپنی غربت اور دیگر پریشانیوں کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ جاری نہیں رکھ پائیں گے، ان کو منصوبہ بند طریقہ سے آئندہ محروم بنادینے کا انتظام کرلیا گیا ہے۔ایک سال پر تعلیم چھوڑنے والے کو سرٹیفیکٹ دے کر کالج اور سرکار نے اپنا پلہ جھاڑ لیا ہے، دوسال پر ڈپلومہ کا کاغذ دے کر انھیں الوداع کہہ دیا گیا ہے۔کیا اس ناقص ڈگری پر ان طلبہ کو کہیں نوکری مل سکے گی؟ یہ سرٹیفیکٹ اور ڈپلومہ تو کسی خاص مضمون کا بھی نہیں ہے کہ اس کی اہمیت ہو، یہ محض گریجویشن کی چھوٹی تعلیم ہے۔اور یہ طلبہ کیا پھر اس حیثیت میں آپائیں گے کہ تعلیم آگے بڑھاسکیں؟ تو ایسے طلبہ کی بھاری تعداد اعلی تعلیم سے پیچھے رہ جائے گی، اور سرکاری کاغذ پر ڈراپ آؤٹ زیرو ہوگا۔ تو یہ بھی اس پالیسی کی خاص پہچان ہے۔

ریسرچ کسی قوم کی ترقی کیلئے ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ موجودہ پالیسی میں یہ ایک بندھوا مزدور بن گیا ہے۔ذرا غور کیجئے! پورے ملک کے ریسرچ پر نگرانی کیلئے ایک علاحدہ انتظامی ادارہ بنایا گیا ہے جو وزیراعظم کے ماتحت ہوگا۔اب آپ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اس ادارہ کے ذریعہ کیسا ریسرچ ہوگا، اور کن تحقیقات کے دروازے بند ہوجائیں گے۔گذشتہ چند برسوں کی تصویر نظر میں لے آیئے۔سچ، سوال، تنقید، تردید، اور تحقیق کے بغیر صرف طوطے کی آواز دوہرانے سے ریسرچ کا کیسا معیار بنے گا اس کا اندازہ لگالینا چاہئے۔اور سب سے اہم بات یاد کرلیجئے۔پچھلے برسوں میں تعلیم کے کتنے اعلی ادارے قائم ہوئے، کتنے اسکول کھولے گئے، تعلیم پر کتنا خرچ کیا گیا، تعلیمی اداروں میں فکر وتحقیق رکھنے والے کتنے افراد کو عہدے دیئے گئے، اداروں کی سربراہی طے کرنے کا معیار کس قابلیت کو بنایا گیا، اور تعلیمی اداروں میں جمہوری قدروں اور تعلیمی تحقیق کی

کس روح کو پروان چڑھایا گیا؟؟ بس ماضی کے برسوں کی یہی روایت آگے کی ہر شکل درشادے گی۔اس تعلیمی پالیسی مسودہ کو لائن لائن اور حرف حرف پڑھئے، نشانات لگایئے، اور دیکھئے کہ اس کے چمکتے الفاظ کے پہلو بہ پہلو ہی، اور اس کی لائنوں میں ہی کیا کچھ لکھ دیا گیا ہے۔زیادہ تر صاف، اور بہت سی جگہ اشاروں میں۔ پڑھئے اور خود واقف بنئے اور دوسروں کو واقف کیجئے۔

راہ عمل:

قومی تعلیمی پالیسی پر اب کافی لوگوں نے نظر ڈال لی ہے، اور متعدد اچھی تحریریں اور سنجیدہ رائیں سامنے آئی ہیں۔ پالیسی ملک کے مفاد کیلئے غیر سنجیدہ، بھاری اکثریت کو تعلیم سے محروم کردینے والی، تحقیق وفکر کو ختم کرنے والی، طبقاتی تقسیم اور انسانوں میں نفرت بونے والی، اور ایک مذہب کو تھوپنے والی ہے۔مخصوص پلاننگ سے بھری اس ضخیم پالیسی کو ابھی مزید گہرائی سے پڑھنے اور نقصانات کو سامنے لانے کی ضرورت ہے، اور ملک کے مخلص سنجیدہ لوگ اس میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ بھی اس پالیسی کو خود پڑھیں، اور مستند طریقہ پر خود باخبر بنیں۔اس پالیسی کی تباہ کاریوں اور نئی نسل کی غلامی کے منصوبوں کے خلاف آوازیں اٹھنی شروع ہوگئی ہیں، لکھنے والے الگ الگ خطرات اور نقصانات پر لکھیں گے، اور ملک وملت کو بچانے کی کوشش کریں گے۔ آپ بھی ملک کے مفاد اور قوم کی بہتری کیلئے اپنی خدمات پیش کریں۔ بہت سے کام اور اشتراک آپ کر سکتے ہیں، تو سوچیں اور کریں۔

اس پالیسی کے تئیں اور ملک وملت سے وابستہ مسائل کے تئیں ہمیں ایک ساتھ دو کاموں کی ضرورت رہتی ہے، اور دونوں کرنا ضروری ہے۔ملت کے اندر یہ دونوں کام بانٹ لینا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔اس تعلیمی پالیسی 2020 کا بڑا حصہ ملکی مفاد کے خلاف ہے، تعلیم کا نصاب اور طریقہ ذہنوں کو ترقی سے پیچھے کردے گا، خوشحال طبقہ کے سوا ملک کی اکثریت اچھی تعلیم سے محروم رہ جائے گی، سرکار کی تعلیمی ذمہ داری کم اور ختم ہوجائے گی، قابل اساتذہ کو نوکری نہیں ملے گی، غربت مزید بڑھ جائے گی، اور سائنسی ترقی اور معیار میں ملک پیچھے سے پیچھے ہوتا چلا جائے گا۔ یہ سارے نمونے پچھلے چند برسوں میں دیکھے جاچکے ہیں، اور ابھی کرونائی دور میں اسکول کی آٹھویں، نویں، دسویں کلاسز کی نصابی کتابوں سے سائنسی اور جمہوری اقدار کے اسباق نکال کر مخصوص چیپٹرس شامل کرکے تبدیلی اور عزائم کا اندازہ کرادیا گیا ہے۔تو یہ سارے کام ملکی مفاد کے ہیں، ملک کے لوگ مل کر کام کریں گے، ہم اس میں ساتھ ہوں، آگے بڑھیں، اور ملت کے کچھ افراد/ادارے اسی کام کو کریں۔ ہماری خراب کی جانے والی شبیہ اس سے اچھی ہوتی ہے، اور یہ ہماری ذمہ داری بھی ہے۔ملک کی ترقی ملک کے تمام لوگوں کی ترقی ہے۔

پھر یہ پالیسی مذہبی اقلیتوں کو زک پہنچارہی ہے، ملت مسلمہ کو خصوصی نقصان میں لارہی ہے، مذہبی تعلیم، مذہبی عقیدہ، اور مذہب مرکوز تہذیبی شناخت کیلئے سخت خطرات پیدا کررہی ہے۔ ہمارے پچھلوں نے اپنے وقت میں ملت کے ایمان وعقیدہ اور تہذیب وشناخت کی حفاظت کے لئے بہت کچھ کیا۔اب آج ہم کو کرنا ہے، جب ہی ہم اور آنے والی نسل مسلمان باقی رہے گی۔ ہمارے دستور نے جو تحفظ دیا ہے، اس کی روشنی میں مسلم اقلیت کیلئے خطرات کو سامنے لائیں، اور کچھ افراد /ادارے اس کام کو ہی بصیرت ومحنت سے انجام دیں۔

تو یہ دونوں کام اس وقت ضروری ہیں، اپنی صلاحیتوں اور امکانات کے لحاظ سے ہم کام منتخب کرسکتے ہیں۔دونوں ہمارے کام ہیں، دونوں ملک کے مفاد کیلئے ضروری ہیں، اور دونوں ملت کی بہتری کیلئے ضروری ہیں۔اور سیاسی قوت ان سب کی کنجی ہے۔کاش کہ جلد ہم سمجھ لیں، اور اتحاد کی قوت ہر ممکن پیدا کرکے اس کنجی میں حصہ دار بن جائیں، پہلے تھے، پھر بن سکتے ہیں۔

☆☆☆

❑ اسلامی تعلیمات

ایک نیا مشرکانہ نعرہ

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اسلام کا سب سے بنیادی عقیدہ 'عقیدۂ توحید' ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے، ان کی بنیادی تعلیم یہی تھی کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی عبادت کے لائق ہیں اور اسی کی عبادت کرنی ہے: "وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحي إليه أنه لا اله الا انا فاعبدون" (الانبیاء:۲۵) جہاں یہ بات ضروری ہے کہ اللہ کو ایک مانا جائے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ کسی اور کو اس کی خدائی میں شریک نہیں ٹھہرایا جائے، اسی لیے علم کلام کے شارحین نے لکھا ہے کہ کلمہ لا الہ الا اللہ میں نفی اور اثبات دونوں پہلو کی رعایت ضروری ہے کہ اللہ کی ذات معبود ہے اور اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں، (شرح العقیدۃ الطحاویہ: (۱۰۹) اگر قرآن مجید کی الفاظ کے تہہ میں جھانک کر دیکھا جائے تو شاید ہی کوئی ایت ہو جس میں صراحتاً یا اشارۃً براہ راست یا بالواسطہ توحید کا ذکر نہ آیا ہو؛ لیکن کم سے کم اکیانوے آیتیں ایسی ہیں جو صراحتاً اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو بیان کرتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں تو اتنی کثرت سے اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارے میں منقول ہیں کہ اگر ان سب کو جمع کر دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے گی، یہی عقیدہ آپ کی زندگی بھر کی دعوت اور آپ کی تعلیمات کا خلاصہ ہے، آپ نے پانچ باتوں کو اسلام کی بنیاد قرار دیا اور توحید کو اس کا سب سے پہلا رکن بتایا، (بخاری، عن عبداللہ بن عمرؓ، حدیث نمبر:۸) 'لا الہ الا اللہ' کو جنت میں داخل ہونے کی کلید قرار دیا گیا، حضرت عثمان غنیؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جو بھی لا الہ الا اللہ پر یقین رکھتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگا، وہ جنت میں داخل ہوگا: "من مات وهو يعلم انه لا اله الا الله دخل الجنة" (مسلم، حدیث نمبر:۲۶) توحید کی ضد شرک ہے، شرک سے مراد ہے: کسی بھی مخلوق کو- خواہ وہ اپنی طاقت، پھیلاؤ، ظاہری نفع رسانی، ضرر رسانی اور علو مرتبت کے اعتبار سے کتنی ہی بڑی ہو، اللہ کی ذات میں یا آپ کی صفات واختیار میں شریک اور ساجھی ٹھہرانا، توحید کی جتنی زیادہ تاکید کی گئی ہے، شرک کی اتنی ہی زیادہ برائی اور مذمت بیان کی گئی ہے، قرآن مجید نے انبیاء کے اپنی قوموں سے خطابات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، ان میں ہر جگہ شرک کی مذمت کی گئی ہے اور

اس کو سب سے زیادہ مبغوض اور قابل نفرت فعل ٹھہرایا گیا ہے۔

قرآن مجید ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ صرف یہی کافی نہیں ہے کہ انسان اللہ کو ایک مانے اور عملی طور پر اپنے آپ کو شرک سے بچائے رکھے؛ بلکہ موقع ومحل کے لحاظ سے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عقیدۂ شرک اور مشرکانہ شعائر (جس میں مشرکانہ نعرے بھی شامل ہیں) سے اپنی برأت اور بے تعلقی کا اظہار کرے، اسی لیے پیغمبروں نے اپنی قوم سے کہا کہ میں ان تمام مشرکانہ چیزوں سے بری اور بے تعلق ہوں، جن کو تم کیا کرتے ہو، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: "یاقوم انی بری مما تشرکون" (الانعام:۷۸) اور حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو گواہ بناتے ہوئے فرمایا کہ تم سب گواہ رہنا کہ میں تمہارے مشرکانہ افعال سے بری ہوں: "واشهدوا انی بری مما تشرکون"۔ (ہود:۵۴)

رسول اللہؐ نے نہ صرف عقیدۂ توحید کی تعلیم دی، بلکہ ہر لمحہ اس کو ذہن میں راسخ کرنے کے لیے ایسی دعائیں سکھائیں، جو ہر عمل کے ساتھ انسان کو خدائے واحد کی یاد دلاتی ہے، کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد، صبح میں اور شام میں، سفر کی طرف جاتے اور واپس آتے ہوئے، ایک دوسرے کو سلام کرتے ہوئے، غرض کہ کوئی موقع ایسا نہیں جس میں دعا اور ذکر کے اسلوب میں اللہ کی وحدت کا یقین انسان کے ذہن میں راسخ نہ کیا گیا ہو، اسی طرح شرک کے جتنے راستے ہوسکتے تھے، اسلام نے ان سب کو بند کیا، بعض گذشتہ آسمانی مذاہب میں مجسمہ بنانے کی اجازت تھی؛ لیکن شریعت محمدی میں اسے منع کردیا گیا؛ کیوں کہ یہ چیز بتدریج انسان کو شرک تک پہنچا دیتی ہے، اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھانے سے منع فرمایا گیا: "من حلف بغیر الله فقد اشرک" (ابوداؤد، عن ابن عمر، حدیث نمبر:۳۲۵۱) قبروں کو اونچی بنانے کی آپ نے ممانعت فرمائی ہے: "لا تدعن قبراً مشرفاً الا سویته" (نسائی، عن علی، باب تسویۃ القبور اذا رفعت، حدیث نمبر: ۲۰۳۱) کیوں کہ یہ چیز بھی انسان کو شرک تک پہنچا دیتی ہے، بدشگونی کو منع کیا گیا کہ اس میں انسان اپنے نقصان کے لیے خالق کے بجائے مخلوق کو مؤثر سمجھنے لگتا ہے: "الطیرة شرك" (ابوداؤد، عن عبداللہ بن مسعود، حدیث نمبر:۳۹۱۰)

آپ نے ایسی باتوں کو بھی منع فرمایا، جن میں شرک کا شبہ پایا جاتا تھا، صحابہ نے آپ کو سجدہ کرنے کی اجازت طلب کی، ظاہر ہے کہ صحابہ عبادت کی نیت سے سجدہ کی اجازت کیسے مانگ سکتے تھے؟ مقصود تعظیم واحترام کے طور پر سجدہ کرنا تھا؛ لیکن آپ نے اس سے بھی منع فرمادیا، (مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۲۶۳۵) رب کے معنی آقا اور مالک کے بھی ہیں، اسی لیے اسلام سے پہلے غلام اپنے مالک کو رب کہا کرتے تھے؛ لیکن چوں کہ رب، اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں شامل ہے، اس لیے اس بات کی ممانعت کردی گئی کہ کوئی غلام اپنے مالک کو رب کہے، عبد کے معنی بندے کے بھی ہیں اور غلام کے بھی، اسی نسبت بندگی کو ظاہر کرنے کے لیے انسان کو 'عباد اللہ' کہا جاتا ہے، اس لفظی مشابہت سے بچانے کے لیے آپ نے اس بات سے منع فرمایا کہ غلام کو ''میرے عبد'' (یا عبدی) کہہ کر مخاطب کیا جائے۔

(مسلم، کتاب الالفاظ من الادب وغیرہا، باب حکم اطلاق لفظۃ العبدۃ، حدیث نمبر:۲۲۴۹)

ہر مسلمان اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ آخرت کی کامیابی اور ناکامی توحید اور شرک سے متعلق ہے؛ چنانچہ رسول

اللہ سے دریافت کیا گیا: وہ دوکونسی چیزیں ہیں جو جنت کو اور دوزخ کو واجب کرنے والی ہیں؟ آپ نے فرمایا: جس کی موت اس حال میں ہو کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراتا ہو تو وہ جنت میں داخل ہوگا، اور جس کی موت اس حال میں آئے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہو تو وہ دوزخ میں داخل ہوگا، (مسلم عن جابرؓ، حدیث نمبر: ۹۳) اسی لیے کوئی مسلمان اس بات کو گوارہ نہیں کرسکتا کہ اپنی زبان سے مشرکانہ کلمہ کا تلفظ کرے، ہر مسلمان کے لیے حضرت معاذ بن جبلؓ کی یہ حدیث سامنے رکھے جانے کے لائق ہے کہ رسول اللہؐ نے مجھے دس باتوں کی نصیحت فرمائی، جن میں سے پہلی بات یہ ہے کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، چاہے تم کو مار ڈالا یا جلا ڈالا جائے: "لا تشرك بالله شيئاً و ان قتلت و ان حرقت"۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۱۲۸)

اسلام میں عقیدۂ توحید کی اہمیت اور شرک کے ناقابل قبول ہونے کی وجہ سے کسی مسلمان سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی مخلوق کو محبوب سے بڑھ کر معبود کا درجہ دے دے، محبت ماں باپ سے ہوتی ہے، اولاد سے ہوتی ہے، شوہر و بیوی سے ہوتی ہے، اسی طرح اس مٹی سے بھی ہوتی ہے، جس میں وہ پیدا ہوا ہے، جس کی فضاؤں میں وہ پروان چڑھا ہے، یہ ایک فطری محبت ہے، جیسے انسان کو یہ سمجھانے اور یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ تمہیں اپنی اولاد سے محبت کرنی چاہیے، اسی طرح وطن کی محبت بھی ایک فطری چیز ہے، انسان پردیس میں رہتے ہوئے اپنے ملک کی ایک ایک چیز کو یاد کرتا ہے، اگر اس کے ملک سے وابستہ کوئی خبر مل جائے تو اسے شوق کی آنکھوں سے پڑھتا ہے، اجنبی ملک میں رہتے ہوئے اپنے وطن کا کوئی آدمی مل جائے تو گھنٹوں اس سے بات کرنا چاہتا ہے، کہیں جا کر اپنے وطن کو واپس آئے تو دل کو سکون اور آنکھوں کو راحت میسر آتی ہے، اسی لیے کسی ملک میں رہنے والے کو اس ملک سے محبت کی یاد دلانا ایک بے معنی اور غیر منطقی بات ہے اور پھر یہ بڑا ظلم ہے کہ ایک گھر میں چار بھائی رہتے ہوں اور ایک بھائی دوسرے بھائی سے مطالبہ کرے کہ تم اس گھر سے وفاداری اور محبت ثابت کرو، محبت اور وفاداری کا مطالبہ کرایہ دار اور مزدور سے تو کیا جاسکتا ہے، لیکن مالک اور حصہ دار سے نہیں کیا جاسکتا۔

افسوس کہ اس ملک میں نفرت کے سوداگروں کا اقلیتوں کے ساتھ یہی رویہ ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آزادی کی لڑائی میں انگریزوں کی پشت پناہی اور قوم سے غداری کا راستہ اختیار کیا اور ملک کی آزادی کے لیے ان کے تلوؤں میں ایک کانٹا بھی نہیں چبھا، یہ مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے مختلف خود ساختہ نعرے وضع کرتے ہیں اور اس کو حب الوطنی کے لیے کسوٹی قرار دیتے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ ہر آدمی کو وندے ماترم کہنا چاہیے اور اب کہتے ہیں کہ لوگوں کو 'بھارت ماتا کی جے' کہنا سکھانا چاہیے، سوال یہ ہے کہ آپ کو کیا حق ہے سکھانے کا، کیا ہمارے ملک کے دستور نے ایسا نعرہ لگانے کی تلقین کی ہے؟

آر ایس ایس نے تو اس قسم کی بحثیں اصل مسائل سے توجہ ہٹانے اور اپنی دلت دشمنی کے کھلتے ہوئے راز پر پردہ ڈالنے کے لیے چھیڑ دی ہے، لیکن بہت سے مسلمان بھائیوں نے آر ایس ایس کی آئیڈیالوجی کو سمجھے بغیر اس کو مادر وطن سے محبت کا ایک سیدھا سادہ جملہ سمجھ لیا ہے، یہ غلط فہمی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر ''بھارت ماتا کی جے'' کا معنی صریح اور متعین طور پر وطن کو معبود قرار دینے کا نہ ہو تب بھی اس فقرہ میں وطن کی

معبودیت کا اشارہ ضرور پایا جاتا ہے اور اس کے کئی قرائن ہیں: اول یہ کہ یہ اس بدنام زمانہ ناول میں درج کیا جانے والا نعرہ ہے، جسے ۱۸۸۲ء میں بنگال کے ہنکم چندر اچڑ جی نے آنندامت کے نام سے لکھا، اس ناول کا مرکزی خیال ہی یہی ہے کہ وطن کو خدا کا درجہ دیا جائے، دوسرے ہندوستان میں بنارس اور ہری دوار کے بشمول کم سے کم چار مندر بھارت ماتا کے نام سے بنائے گئے ہیں، بنارس کے مندر کی بنیاد گاندھی جی نے رکھی تھی، جس میں کوئی مورتی نہیں ہے اور دوسرے مندر کی اندرا گاندھی نے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس بھارت ماتا کی تعبیر میں ملک کو معبود کا درجہ دیا گیا ہے، تیسرے ماتا کے معنی اگرچہ ماں کے ہیں لیکن ہندو دیویوں کو بکثرت ماتا کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے درگا ماتا، کالی ماتا، لکشمی ماتا، یا گائے کو گئو ماتا، چوتھے: 'ماتا' کا ترجمہ سنسکرت میں ماں باپ، لڑکی اور سرپرست کے ساتھ ساتھ درگا کے پاس آنے والے سے بھی کیا گیا ہے، نیز اس کو سنسکرت الفاظ گھٹا کا (Ghataka) اور وسوا (Visva) کا مترادف قرار دیا گیا، گھٹا کا کے معنی مارنے والے کے اور 'وسوا' کے معنی یقین و بھروسہ کئے جانے کے لائق کے ہیں، یہ وہ صفات ہیں جو مختلف مذاہب میں خدا کے لیے ذکر کی جاتی ہیں، پانچویں: بھارت ماتا کو مختلف شکلوں میں ہی پیش کیا گیا ہے، اس وقت آر ایس ایس جو تصویر پیش کر رہی ہے، اس کے مطابق اس کے ایک ہاتھ میں تلوار یا ترشول ہے اور وہ شیر پر بیٹھی ہوئی ہے، دوسرے ہاتھ میں بھگوا جھنڈا اور بعض تصویروں میں اس کے کئی کئی ہاتھ ہیں، یہ تقریباً اسی طرح کی تصویر ہے، جو ہمارے ہندو بھائیوں کی دیویوں اور دیوتاؤں کی ہوتی ہے، چھٹے: یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ 'بھارت' کا نام جس راجہ کے نام پر ہے، وہ مرد تھا نہ کہ عورت، اس لیے بھارت ماتا میں اس راجہ کی نسبت نہیں ہوسکتی، یہ کسی مذہبی دیوی ہی کی جیت کا نعرہ ہوسکتا ہے، لیکن چونکہ جے میں زندہ رہنے کے معنی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت ''حی'' (ہمیشہ زندہ رہنے والے) کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا کرتا ہے، شاید اسی لیے ہمارے ہندو بھائی 'جے شری رام، ہنومان جی کی جے، جے بجرنگ بلی، وغیرہ' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، خود سنسکرت لغت میں اس کا ایک ترجمہ ''اِندر کی جیت'' سے کیا گیا ہے، (ماتا اور جے کے یہ ترجمے "Sir Monier Villiams" کی سنسکرت، انگلش ڈکشنری سے لیے گئے ہیں)۔

اس لیے غالب گمان یہی ہے کہ اس فقرہ میں وطن کی معبودیت کا ذکر ہے نہ کہ صرف محبوبیت کا، اگر ایسا نہ ہوتا تو سنگھ پریوار کے لوگوں کو اس لفظ پر اتنا اصرار نہ ہوتا، اس لیے کہ ان کے یہاں حب الوطنی مقصود نہیں، اگر وہ محبّ وطن ہوتے تو شروع سے ترنگا لہراتے اور ملک کے دستور پر یقین کا اظہار کرتے، لیکن انھوں نے بمشکل تمام کچھ عرصہ پہلے سے یہ کڑوا گھونٹ اپنے حلق سے اتارا ہے، ان کا مقصد اپنے مذہبی تصورات کو دوسری قوموں پر مسلط کرنا ہے، اس لیے مسلمانوں کو کسی بھی قیمت پر ایسے مشرکانہ یا کم سے کم شرک آمیز نعروں کو قبول نہیں کرنا چاہیے، یہ ان کو آزمانے کی اور بتدریج اس مقام تک لانے کی کوشش ہے جو فرقہ پرست تنظیموں کا منصوبہ ہے، ہم وطن سے محبت اس لیے رکھتے ہیں کہ ہمارے پیغمبر نے ہمیں اس کی تعلیم دی ہے، ہمیں اس کے لیے کسی کی سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں ہے، لیکن کوئی بھی مسلمان جانتے بوجھتے ایسے نعروں کو قبول نہیں کرسکتا۔

☆☆☆

❑ نقطۂ نظر

سیکولرازم اور اسلام

محمد نفیس خان ندوی
(رفیق دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی)

مغربی مفکرین نے عالمی سطح پر جو پرفریب نعرے دیے ہیں ان میں جمہوریت کے بعد سب سے نمایاں نعرہ ''سیکولرازم'' کا ہے، سیکولرازم لاطینی لفظ ''سیکولم'' (Seculam) سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی دنیا کے ہیں، قرون وسطیٰ میں رومن کیتھولک پادری دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے، ایک گروہ ان پادریوں کا تھا جو کلیسا کے اصول وضوابط کے تحت خانقاہوں میں رہتے تھے، اور دوسرے گروہ میں وہ پادری تھے جو عام شہریوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے، کلیسا کی اصطلاح میں ایسے پادریوں کو ''سیکولر پادری'' کہا جاتا تھا، اسی طرح وہ تمام ادارے بھی سیکولر کہلاتے تھے جو کلیسا کے ماتحت نہ تھے۔

عصر حاضر میں سیکولرزم اس نظام زندگی کو کہتے ہیں جس میں مذہب کا کوئی بھی عمل دخل نہ ہو، چاہے اس کا تعلق علم وفلسفہ سے ہو، اجتماعی وسماجی زندگی سے ہو یا پھر ریاست وحکومت سے ہو۔

سیکولر علم وفلسفہ کا مطلب یہ ہے کہ کائنات اور مظاہر فطرت کے مطالعہ سے جو نتائج مرتب کیے جائیں وہ خدا کے تصور سے خالی ہوں، اور انسانی سماج کی تشکیل میں جو کچھ سوچا جائے یا کوششیں کی جائیں وہ ہدایات الٰہی سے بے نیاز ہوں۔

اسلام کے نزدیک علم وفلسفہ کا یہ تصور نا قابل قبول ہے، اس کے نزدیک فلسفیانہ غور وفکر کا صحیح منہاج یہ ہے کہ دیانت داری کے ساتھ معلومات جمع کی جائیں پھر ان معلومات کو اس طور پر مرتب کیا جائے کہ اس کے ذریعہ خدا پرستانہ تصور کی تائید ہو۔ اسی طرح اجتماعی زندگی کی تنظیم کے لیے اسلام عقل انسانی کو ناکافی سمجھتا ہے، اس کے نزدیک ہدایت الٰہی پر مبنی شریعت ہی انفرادی واجتماعی زندگی کی حقیقی رہنما ہے، مزید برآں عقل انسانی تربیت کی محتاج ہے، اور اسلام کا تعمیری وتربیتی نظام ہی اس کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ صالح زندگی کی تعمیر میں وہ اپنا مثبت کردار ادا کر سکے۔

سیکولر سوسائٹی کا مفہوم یہ ہے کہ انسانی تعلقات کے لیے جو قدریں اور معاملات کی استواری کے لیے جو اصول وقوانین اختیار کیے جائیں وہ مذہب کی بندش سے آزاد ہوں اور ان کی بنیاد عقل انسانی اور تاریخی تجربات پر ہو۔

لیکن اسلام اس نظریہ کی بالکل مخالفت کرتا ہے، جس کی تین بنیادی وجوہات ہیں: ایک تو یہ کہ عقل انسانی اور تاریخی تجربات محدود ہیں، دوسری یہ کہ تاریخی حقائق اور انسانی عقلوں میں باہم اختلافات موجود ہیں، اور تیسرے یہ کہ عقل انسانی خواہشات اور جذبات میں مغلوب ہو جاتی ہے اور ایسے میں ایک عادلانہ نظام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

ان وجوہات کی بنا پر اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لیے اخلاقی قدریں اور اصول وقوانین سب کا حقیقی سرچشمہ ہدایت الٰہی ہے، اور اسی کے ذریعہ ایک ایسے سماج کی تشکیل ممکن ہے جس میں انسانی عدل وانصاف اور امن وسکون بہرہ مند ہوسکتا ہے، اور اس ہدایت ربانی کے بنیادی مآخذ انبیاء کرام کی دعوت اور قرآن مجید کا نسخۂ ہدایت ہے۔

سیکولر سوسائٹی کا نعرہ عرصہ سے موجود ہے، لیکن دنیا کے کسی بھی خطہ میں ایسی سوسائٹی نہیں بن سکی، اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان کبھی بھی مذہب سے بے نیاز نہیں ہوسکتا، جو سیکولر سماج کا نعرہ دیتے ہیں ان کی زندگیوں میں بھی مذہب کے اثرات موجود ہیں، خاص کر خاندانی نظام اور سماجی تقریبات میں یہ اثرات زیادہ نمایاں ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ سیکولر سوسائٹی بنانے کا نعرہ ایک متحدالمزاج معاشرہ بنانے میں ہمیشہ ناکام رہا ہے، بلکہ اس کے ذریعہ ایسی سوسائٹی وجود میں آتی ہے جس میں قسم قسم کے تضاد موجود ہوتے ہیں۔ جبکہ اسلام انسانی زندگی کو ہر قسم کے تضاد سے پاک دیکھنا چاہتا ہے۔

سیکولر حکومت یعنی ایک ایسا طرز حکومت جس میں عوام کو اپنے مذہبی امور میں اختیار ہو کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق عمل کریں، اور دیگر تمام اجتماعی امور میں وہ حکومت کے بنائے ہوئے قوانین اور طریقوں کے پابند ہوں، اگر حکومت جمہوری ہو تو یہ قوانین طے کرنے والے وہ افراد ہوں گے جو عوام کے نمائندے کہلاتے ہیں، اور اگر حکومت آمرانہ ہو تو یہ قوانین وضوابط وہ لوگ طے کریں گے جو حکومت پر قابض ہوں۔

اس طرز حکومت کو اختیار کرنے کی سب بڑی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ہر ملک میں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ بستے ہیں، اجتماعی اور سیاسی زندگی بہرحال ان سب کو مل کر گذارنی ہے، اور چونکہ مذاہب بہت سارے ہیں اس لیے کسی مذہب کو رہنما بنانے کے بجائے عقل انسانی کو ہی رہنما بنانا ناگزیر ہے۔

اس نظریہ پر اسلام کے حوالہ سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ چونکہ مذاہب مختلف ہیں تو یقیناً ان کے ماننے والوں کے نظریات اور فلسفۂ زندگی بھی متعدد ہوں گے، ایسی صورت میں کسی ملک میں ایک طرح کا پائدار سماج تشکیل نہیں پاسکتا، بلکہ ہر کچھ فاصلہ پر جہاں ایک ہی سماج کے ماننے والے ہوں وہاں ایک نیا سماج ہوگا اور جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے ہوں گے وہاں کا سماج باہمی رسہ کشی، فرقہ پرستی اور انتشار کا شکار ہوگا۔

عقل انسانی کی محدودیت اور کمزوریاں بالکل واضح ہیں، چنانچہ اس کی رہنمائی ناقابل اعتماد ہے، اس کے علاوہ انسانی عقلوں میں باہم اختلافات ہیں، اس لیے عملاً اکثریت کی رائے مانے بغیر چارہ نہیں، اور اکثریت کی رائے غلطی کرسکتی ہے اور کرتی ہے، اس کے علاوہ کسی مسئلہ پر اکثریت کا رائے اجتماع بھی عملاً مشکل ہے۔

سیکولر سیاست کے حوالہ سے اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو امور خالص مذہبی قسم کے ہوں ان میں ہر گروہ آزاد ہو، لیکن جن امور کا تعلق اجتماعی وسیاسی زندگی سے ہو ان میں ان آفاقی اقدار کو اختیار کرنا ضروری ہے جو نوع انسانی کی مشترک میراث ہیں، اور جنھیں ہدایات الٰہی نے قانون کی شکل دی ہے جسے اسلام کی اصطلاح میں میں شریعت سے تعبیر کا جاتا ہے۔

ایک سیکولر حکومت میں اجتماعی زندگی کے لیے ایسے اصول ونظریات ہونے ضروری ہیں جو فطرت انسانی سے ہم آہنگ ہوں، اور اسلام نہ صرف اس کا دعویٰ کرتا ہے بلکہ وہ عملی نمونے بھی پیش کرتا ہے جبکہ دوسرے مذاہب کا دائرہ نہایت محدود ہے، اور ان کا اپنی آفاقیت یا فطرت سے موافقت کا دعوی بھی نہیں۔ اس لحاظ سے صرف اسلام کا پیش کیا ہوا نظام زندگی ہی ایک حقیقی اور کامیاب زندگی کا ضامن ہے۔

☆☆☆

❑ بحث و نظر

امام ابوحنیفہ — مسلکی اصول اور حدیث کے سلسلے میں آپ کا نقطۂ نظر

تحریر: ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم
تلخیص وترجمانی: مولانا فرید حبیب ندوی

نسب اور عمر:

ابوحنیفہ نعمان بن ثابت بن زوطی، ائمہ اربعہ میں سے ہیں اور ان میں سب پہلے آپ ہی پیدا ہوئے۔ سب سے زیادہ مقلدین بھی آپ ہی کے ہیں۔ کوفے میں ۶۳ھ یا ۷۰ھ یا مشہور قول کے مطابق ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ بعض حضرات نے تاریخ ولادت کے بارے میں دوسرے قول کو ترجیح دی ہے، ۱۵۰ھ میں بغداد میں وفات ہوئی۔ بغداد میں آپ کے نام پر ایک محلّہ ''اعظمیہ'' کے نام سے ہے، وہیں آپ کا مزار ہے جو زیارت گاہ خلائق ہے۔

نشو ونما اور مدرسہ:

اُس زمانے میں کوفہ بڑے اسلامی شہروں میں سے تھا اور ہر جماعت کے علما کا مرکز بنا ہوا تھا۔ نحو وصرف اور ادب ولغت کے ائمہ اس میں سب سے زیادہ تھے۔ امام صاحب نے پہلے علم کلام میں مہارت حاصل کی اور اس علم میں مرجعیت حاصل کر لی، پھر کوفے کے شیخ الفقہا حماد کے حلقے سے وابستہ ہو گئے۔ اس حلقے کا سررشتہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے جاملتا ہے کہ حماد نے ابراہیم نخعی سے اور نخعی نے علقمہ بن قیس سے اور علقمہ نے حضرت ابن مسعود سے علم حاصل کیا تھا۔ امام ابوحنیفہ حضرت حماد کی وفات (۱۲۰ھ) تک انھی سے وابستہ رہے۔ حماد کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں نے آپ کو استاد کا جانشین بنالیا۔ اس طرح کوفے کے مدرسے کی صدر نشینی آپ کے حصے میں آئی۔ اس مدرسہ ومکتبۂ فکر کو ''مدرسۃ الرأی'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آپ بلا اختلاف کوفے کے امام بن گئے۔ آپ کی شہرت بام عروج کو پہنچ گئی۔ آپ نے بصرہ، کوفہ، مدینہ اور بغداد کے مشاہیر علما سے ملاقات کی، استفادہ بھی کیا اور افادہ بھی۔ آپ کی شہرت اس حد تک پہنچ گئی کہ آپ کے حلقے میں ایک طرف ابن مبارک اور حفص بن غیاث جیسے کبار محدثین، ابو یوسف، محمد بن حسن شیبانی، حسن بن زیاد اور زفر جیسے عظیم فقہا، اور دوسری طرف فضیل بن عیاض اور داؤد الطائی جیسے درویش و بزرگ حضرات شامل تھے۔ آپ نے پوری زندگی علمی امانت ادا کرنے، عبادت میں مشقت اٹھانے، معاملات میں استقامت، زہد فی الدنیا اور اللہ ورسول اور مسلمانوں کے لیے خیر خواہی میں گزاری۔

آپ کے مسلک کے اصول:

بیہقی نے یحیی بن خریس کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ سفیان کے پاس ایک شخص آیا، اس وقت میں وہاں موجود تھا۔ اس نے کہا کہ اے سفیان! آپ ابوحنیفہ پر تنقید کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے کہا کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے ابوحنیفہ کو

کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں پہلے کتاب اللہ سے لیتا ہوں، نہ ملے تو سنت رسول اللہ سے، اس کے بعد صحابہ کے اقوال سے، ان میں سے جس کے قول کو چاہتا ہوں اختیار کرتا ہوں اور جسے چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں؛ لیکن ان کے قول سے باہر نہیں جاتا، اور جب بات ابراہیم نخعی، شعبی، ابن سیرین، حسن، عطا، اور ابن مسیّب (اور بھی کچھ لوگوں کے نام لیے) تک جا پہنچتی ہے تو جس طرح انھوں نے اجتہاد کیا، میں بھی اجتہاد کرتا ہوں۔

قرآن وحدیث اور اقوال صحابہ کی عدم موجودگی میں آپ قیاس کی طرف رجوع کرتے۔ قیاس کی ایک قسم آپ کے یہاں استحسان کے نام سے پائی جاتی ہے جسے قیاس خفی کہا جاتا ہے۔

آپ کے خلاف فساد انگیزی:

آپ کے یہ اصول بالکل وہی اصول ہیں جو دیگر ائمہ، خاص کر ائمۂ ثلاثہ کے ہیں۔ آپ کی خدمات اور جلالت شان کو دیکھتے ہوئے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سارے مسلمان آپ کی عظمت وجلالت پر متفق ہوتے، مگر آپ کی زندگی میں بھی اور آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے بارے میں بڑا ہنگامہ کیا گیا۔ بہت سوں نے آپ پر طعن وتشنیع کے تیر بھی برسائے۔

اس فساد وشر انگیزی کے اسباب:

۱۔ امام صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے استنباطِ فقہ میں اتنی وسعت اختیار کی اور اصول سے فروع در فروع نکالتے رہے اور فرضی مسائل وواقعات کے بھی جوابات بیان کیے، جب کہ علما اسے ناپسند کرتے تھے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو سوال فرماتے کہ کیا یہ پیش آچکا ہے، اگر جواب نفی میں ملتا تو کہتے کہ اسے چھوڑے رکھو اس وقت کے لیے جب یہ پیش آئے گا۔

لیکن امام صاحب کا خیال تھا کہ ایک فقیہ ومجتہد کو چاہیے کہ مسائل کے پیش آنے سے پہلے وہ جواب تیار رکھے۔

خطیب بغدادی نے آپ کے اس نقطۂ نظر کی وضاحت اس طرح کی ہے:

''حضرت قتادہ کوفہ آئے تو امام ابوحنیفہ نے ان سے پوچھا کہ اے ابوخطاب! اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ: ''ایک شوہر اپنی بیوی سے کئی سال تک دور رہا، اس کی بیوی نے سمجھا کہ شاید مر چکا ہے اور دوسرے شوہر سے شادی کر لی، پھر پہلا شوہر واپس آگیا تو اس عورت کے مہر کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ یہ سوال کرنے سے پہلے امام صاحب اپنے شاگردوں سے کہہ چکے تھے کہ اگر یہ (قتادہ) اس سلسلے میں کوئی حدیث پیش کریں گے تو جھوٹی ہوگی اور اگر اپنی رائے سے جواب دیں گے تو غلطی کریں گے۔ قتادہ نے کہا: کیا یہ مسئلہ پیش آچکا ہے؟ آپ نے کہا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ جو مسئلہ پیش نہیں آیا اس کے بارے میں آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ہم مصیبت کے نازل ہونے سے پہلے مصیبت سے نمٹنے کی تیاری کر کے رکھتے ہیں۔

امام صاحب اور آپ کے اصحاب کو ''اہل رائے'' اور "أرأيتيون" کہا جاتا تھا؛ کیوں کہ یہ حضرات "أرأيت" سے خوب کام لیتے تھے۔

امام صاحب نے استنباط اور تفریع میں اتنی وسعت پیدا کی کہ صاحب عنایہ کے بقول آپ نے جو مسائل مستنبط کیے، ان کی تعداد ۱۲ لاکھ ستر ہزار کے قریب ہے۔ اگر اس مقدار کو مبالغے پر محمول کیا جائے، تب بھی آپ کے مستنبط کردہ مسائل دیگر اماموں سے کہیں زیادہ ہیں۔ آپ کی تفریع مسائل میں کثرت کی وجہ سے بعض ناقدین نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''ابوحنیفہ اس کو تو سب سے زیادہ جانتے ہیں جو ابھی پیش نہیں آیا ہے، اور جو پیش آچکا ہے اس کے بارے میں سب سے بڑے جاہل ہیں''۔

۲۔ امام صاحب حدیث قبول کرنے میں بڑے متشدد تھے۔ آپ کے شرائط محدثین کے شرائط سے بھی کڑے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عراق وضعِ حدیث کا مرکز بن چکا تھا، اس لیے آپ

نے احتیاطاً کڑے شرائط لگائے ،جس کی وجہ سے بہت سی وہ حدیثیں جو محدثین کے نزدیک صحیح تھیں، آپ کے نزدیک ضعیف قرار پائیں۔

۳۔ آپ ثقہ راوی کی مرسل قبول کرلیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے بہت سی وہ احادیث جو محدثین کے نزدیک ضعیف تھیں، آپ نے ان سے استدلال کیا۔

۴۔ حدیث قبول کرنے کے سخت شرائط کے لگانے کے بعد عمل بالحدیث کا دائرہ تنگ ہوگیا اور قیاس اور رائے استعمال کرنے کا دروازہ وسیع ہوگیا، اور اس سلسلے میں اللہ تعالی نے آپ کو بے نظیر صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ قیاس سے اس وسعت وکثرت کے ساتھ استدلال نے آپ کے اور محدثین کے درمیان بعد پیدا کردیا، جس طرح اسی چیز نے آپ کے اور ان فقہا کے درمیان بعد پیدا کیا جو قیاس سے استدلال بالکل نہ کے برابر کرتے ہیں۔

۵۔ امام صاحب استنباط کے موقع پر ایسی ایسی باریکیاں نکالتے تھے جو دوسروں کے بس کا روگ نہیں اور جسے دیکھ کر بڑی حیرانی ہوتی ہے۔

ابن ابی العوام نے اپنی سند سے امام محمد سے نقل کیا ہے کہ ''امام ابوحنیفہ بغداد آئے تو آپ کے اصحاب نے جن میں ابو یوسف زفر، اسد بن عمرو اور دوسرے فقہا تھے، ایک مسئلہ تیار کیا اور اسے دلائل سے مزین کیا ، پھر امام صاحب کے سامنے رکھا۔ امام صاحب نے ان کے جواب سے الگ جواب دیا۔ وہ لوگ چیخنے لگے۔ امام صاحب نے خاموش کیا اور پھر ان کے جو دلائل تھے، انھیں رد کر کے اپنے دلائل پیش کیے، حتی کہ انھوں نے آپ کے قول کو تسلیم کرلیا، پھر آپ نے کہا کہ تمھارا قول صحیح تھا اور یہ قول غلط ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے ہم پر ظلم کیا جب کہ ہم صحیح تھے۔ آپ نے فرمایا: یہ دونوں قول غلط ہیں، تیسرا ایک قول اور ہے وہی صحیح ہے۔ وہ لوگ کہنے لگے: ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ نے دلائل سے اسے بھی ثابت کردیا، پھر وہ کہنے لگے کہ ابوحنیفہ آپ ہمیں صحیح صحیح بتایئے۔ آپ نے فرمایا کہ پہلا قول ہی درست وصحیح تھا اور اس کے دلائل بھی دیے۔ پھر کہا کہ اس مسئلے میں یہی تین پہلو ممکن تھے، ہر ایک کی دلیل ہے؛ لیکن صحیح وہی ہے، لہذا اسی کو اختیار کرو''۔

جسے ایک مسئلے کی مختلف آرا کو اس طرح الٹنے پلٹنے اور ہر ایک کا دفاع کرنے کی عجیب وغریب قدرت حاصل ہو، وہ یقیناً لوگوں میں بہت وسیع النظر، دوررس اور باریک بیں، نصوص سے استنباط کرنے میں بہت گہرائی تک جانے والا اور دلیل وحجت کے اعتبار سے قوی تر ہوگا۔ امام مالک نے جو کچھ آپ کی شان میں کہا تھا شاید وہ مبالغہ نہیں کہ اگر یہ شخص اس ستون کو سونے کا ثابت کرنا چاہے تو دلائل سے ثابت کرسکتا ہے۔

آپ کی ایسی باریک بینی کو دیکھ کر اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ آپ جمہوری رائے کی مخالفت کریں اور ان جمہور محدثین سے الگ رائے قائم کریں جو اکثر نصوص کے ظواہر تک محدود رہتے ہیں، جیسا کہ یحیی بن یمان نے کہا ہے: کچھ ایسے سیدھے سادے محدثین بھی گزرے جن کی سادگی نے ان سے بڑی مضحکہ خیز غلطیاں کرائیں۔ ایک صاحب کے بارے میں ہے کہ استنجا کے بعد بغیر وضو کیے انھوں نے وتر نماز پڑھی اور دلیل کے طور پر یہ حدیث پیش کی کہ ''من استجمر فليوتر''، جب کہ اس سے مراد یہ ہے کہ استنجے کے موقع پر طاق عدد ڈھیلا لینا چاہیے۔ ایک صاحب ''نهى رسول الله عن الحلق قبل صلاة الجمعة'' کی وجہ سے چالیس سال تک جمعے کی نماز سے قبل بال مونڈنے کو ناجائز سمجھتے رہے، جب کہ اس سے حلقے بنا کر بیٹھنے کی ممانعت مراد ہے اور یہ بکسر الحا اور بفتح اللام ہے۔ ایک صاحب نے ''نهى أن يسقى الرجل ماء ه زرع غيره'' سے پڑوسیوں کے باغ کی سینچائی کی ممانعت مراد لی، جب کہ اس سے قیدی حاملہ عورتوں سے وطی کی ممانعت مقصود ہے۔

اس طرح کے عام محدثین امام صاحب کی دقیقہ رسی کو

کیسے سمجھتے؟ اسی وجہ سے سب سے زیادہ بدگمانی اور غلط فہمی انھی حضرات نے پیدا کی۔

۶۔ تنافس انسانی فطرت ہے۔ بہت کم انسان اس سے بچ پاتے ہیں۔ ابن عبدالبر نے ''جامع بیان العلم'' میں ایک خاص فصل علما کے تنافس کے نام سے قائم کی ہے، جس میں اس طرح کے واقعات درج کیے ہیں۔

امام صاحب بھی شہرت وعظمت کی چوٹی کو چھو رہے تھے، جس کی وجہ سے علما کے دلوں میں تنافس پیدا ہونا فطری تھا، یہاں تک کہ مجلسوں میں آپ کی شان میں وہ باتیں کہی جاتیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی طرح کے لوگوں کے بارے میں امام صاحب نے کہا تھا کہ ''ابن ابی لیلی میرے بارے میں ایسی بات کو بھی حلال سمجھتے ہیں جو میں کسی جانور کے بارے میں بھی حلال نہیں سمجھتا''۔

۷۔ آپ نے بہت سے علما کے اقوال کی مخالفت کی۔ ان لوگوں کے پاس بھی احادیث کے دلائل تھے جس کی وجہ سے وہ امام صاحب کو غلط سمجھتے تھے؛ لیکن جب امام صاحب کے تدین، باریک بینی اور دقیقہ رسی کو دیکھتے تو آپ کی تعریف کرنے لگتے۔ "الخیرات الحسان" کے مصنف نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ امام اوزاعیؒ، امام ابوحنیفہؒ کی شہرت کے ابتدائی زمانے میں آپ کے بارے میں غلط گمان رکھتے تھے، ابھی تک آپ سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ اسی دوران ایک مرتبہ امام اوزاعی نے عبداللہ بن مبارک سے پوچھا کہ یہ کون بدعتی ہے جو کوفے سے نکلا ہے جس کی کنیت ابوحنیفہ ہے؟ عبداللہ بن مبارک نے کچھ جواب نہ دیا؛ بلکہ کچھ دقیق ومشکل مسائل ذکر کرکے ان کے بارے میں فتوی بیان کرنے لگے۔ امام اوزاعی نے پوچھا کہ یہ فتاوی کس شخص کے ہیں؟ انھوں نے کہا: ایک شیخ کے جن سے میں نے عراق میں ملاقات کی تھی۔ اوزاعی نے کہا کہ یہ تو کوئی عظیم شیخ ہیں، ان کے پاس جاؤ اور خوب علم حاصل کرو، پھر ابن مبارک نے بتایا کہ یہ ابوحنیفہ ہیں..... اس کے بعد امام اوزاعی کی امام صاحب سے ملاقات ہوئی تو اوزاعی نے ان مسائل کے سلسلے میں جو ابن مبارک نے ذکر کیے تھے مذاکرہ کیا، امام صاحب نے ان کو کھول کھول کر بیان کیا۔ ب دونوں جدا ہوئے تو اوزاعی نے ابن مبارک سے کہا کہ اس شخص کے وفور علم اور اس کی بلا کی ذہانت پر مجھے رشک آتا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہوں، میں غلطی پر تھا۔ تم اس شخص کو لازم پکڑ لو، یہ تو اس کے بالکل برخلاف نکلے جوان کے بارے میں مجھے خبر پہنچی تھی۔

امام ابوحنیفہ کے بارے میں امام مالک اور بعض علما کے اقوال:

امام صاحب کے زمانے کے کبار علما سے امام صاحب کے بارے میں متناقص اقوال منقول ہیں۔ اس کا اندازہ خطیب بغدادی کی تاریخ سے ہوسکتا ہے کہ آپ کی تعریف اور مذمت دونوں میں علما کے اقوال نقل کیے ہیں، اگرچہ ہماری رائے بھی وہی ہے جو عیسی بن ابوبکر الایوبی کی ہے کہ امام صاحب کی مذمت وطعن میں وارد روایات جھوٹی ہیں، مگر اسے بھی ہم بعید نہیں سمجھتے کہ مذکورہ اسباب کی وجہ سے، جن کی مثال امام اوزاعی کے قصے میں گزر چکی ہے، ان روایات میں سے کچھ صحیح ہوں؛ لیکن جن حضرات سے طعن منقول ہے، امام ابوحنیفہ کے مختلف اسفار خاص کر حج کے پچپن اسفار میں جب ان علما کی آپ سے ملاقات ہوئی تو حقیقت کا انھیں پتہ چلا اور پھر انھوں نے بجائے آپ کی مذمت کے، آپ کی تعریف وتوصیف کی۔ اسی وجہ سے بعد میں آپ کے تفقہ اور قوت استدلال کی گواہی علما نے تواتر کے ساتھ دی ہے۔

قاضی عیاض نے ''المدارک'' میں نقل کیا ہے کہ ایک دن امام مالک کی امام ابوحنیفہ سے ملاقات ہوئی۔ ملاقات کے بعد جب مالک باہر آئے تو پسینے میں شرابور تھے۔ لیث بن سعد

نے پوچھا کہ کیا بات پسینہ کیوں آرہا ہے؟ کہنے لگے کہ ابوحنیفہ تو بہت عظیم فقیہ ہیں۔ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ امام صاحب کے شاگردوں نے آپ کے جو اقوال مدون کرائے تھے امام مالک ان کا مطالعہ کرتے تھے حتی کہ آپ کے بیان کردہ تقریباً ساٹھ ہزار مسائل انھوں نے جمع کر لیے تھے۔ یہ بات امام مالک کے حوالے سے ابن ابی العوام سعدی اور ابوعبداللہ بن علی صیمری نے نقل کی ہے۔

امام ابوحنیفہ کی شان میں امام مالک کی مذمت کے جو اقوال منقول ہیں، مالکیہ نے ان کے بہت سے جواب دیے ہیں اور سب نے اعتراف کیا ہے کہ امام مالک امام ابوحنیفہ کے ثنا خواں تھے۔ ابوجعفر الداؤدی نے امام مالک کی طرف سے عذر بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ امام مالک نے یہ غصے کی حالت میں کہا ہوگا۔ ابن عبدالبر کی رائے ہے کہ امام صاحب کے بارے میں امام مالک کی زبان سے جو طعن کی روایات منقول ہیں، وہ امام مالک کے محدثین تلامذہ کے واسطے سے ہیں؛ لیکن امام مالک کے فقہا تلامذہ ان میں سے کسی کو بھی درست نہیں مانتے۔ ابوالولید الباجی نے مؤطا کی شرح میں امام مالک کی طرف ان تمام اقوال کی نسبت ہی کو غلط بتایا ہے اور لکھا ہے کہ امام مالک نے فقہا کے بارے میں کبھی کلام کیا ہی نہیں، صرف بعض رواۃ کے ضبط کے بارے میں کلام کیا ہے اور اس کی یہ دلیل دی ہے کہ امام مالک عبداللہ بن مبارک کا بہت احترام کرتے تھے، حالانکہ ابن مبارک امام ابوحنیفہ کے اخص الخاص تلامذہ میں سے ہیں۔

امام صاحب کی مذمت میں امام شافعی کے جو اقوال منقول ہیں، ان کے جھوٹا ہونے میں تو کوئی شک نہیں؛ کیوں کہ امام شافعی نے تو امام ابوحنیفہ کا زمانہ ہی نہیں پایا، اور آپ کے تلامذہ خصوصاً امام محمد سے استفادہ کیا اور ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر علم حاصل کیا، لہذا یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ آپ امام صاحب کا تذکرہ مذمت کے ساتھ کرتے ہوں گے جب کہ آپ کا یہ جملہ بڑا مشہور ہے کہ: ''لوگ فقہ میں ابو حنیفہ کے محتاج ہیں''۔

امام احمد نے بھی آپ کا دور نہیں پایا؛ بلکہ آپ کے شاگرد امام بو یوسف سے خود ان کے بقول تین سال میں تین ڈھیر کتابوں کا علم حاصل کیا اور امام محمد کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا۔ کسی نے آپ سے پوچھا کہ یہ دقیق جوابات آپ نے کہاں سے لیے؟ کہا: محمد بن حسن کی کتابوں سے۔

ہاں اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ امام احمد سے امام صاحب کے مسلک کے بارے میں کچھ منقول ہو؛ کیوں کہ حدیث سے استدلال کرنے کے باوجود دونوں میں اختلاف تھا کہ امام احمد ضعیف حدیث کو لوگوں کی رائے پر ترجیح دیتے تھے، جب کہ امام صاحب صرف صحیح حدیث ہی کو قبول کرتے تھے اور ضعیف کے مقابلے میں رائے کو ترجیح دیتے تھے، مگر اس طرح کے اختلاف کو طعن نہیں سمجھا جاسکتا۔

اس فتنہ انگیزی کے نتائج:

ان اسباب کی وجہ سے امام صاحب کے خلاف جو طوفان کھڑا کیا گیا، اس کی وجہ سے آپ کی طرف ایسے عقائد و اعمال منسوب کر دیے گئے، جن سے آپ کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ بعض نے آپ کو قدری بتایا۔ کسی نے مرجیہ میں سے بتایا۔ کسی نے کہا کہ آپ تناسخ کے قائل تھے اور کسی نے کہا کہ منکر حدیث تھے۔ اور بہت سوں نے کہا کہ آپ اللہ کے دین میں اپنی رائے اور خواہش کا استعمال کرتے تھے۔

امام صاحب کی وفات اور آپ کے مکتب فقہ کے پھیلنے کے بعد یہ تمام الزامات ھباءً منثورا ہو گئے، مگر دو الزام آج بھی آپ پر لگائے جاتے ہیں: ایک تو یہ کہ آپ حدیث میں بہت قلیل البضاعہ تھے، اور دوسرا یہ کہ آپ حدیث صحیح کے مقابلے میں قیاس اور رائے کو ترجیح دیتے تھے۔

احادیث کے بارے میں امام صاحب کے نقطۂ نظر کی چند مثالیں:

۱۔ دار الخیاطین میں امام ابو حنیفہ کی امام اوزاعی سے ملاقات ہوئی۔ امام اوزاعی نے امام صاحب سے پوچھا کہ آپ رکوع اور رکوع سے کھڑے ہوتے وقت رفع یدین کیوں نہیں کرتے ؟امام صاحب نے جواب دیا: اس سلسلے میں کوئی صحیح روایت آپ ﷺ سے موجود نہیں ہے۔ امام اوزاعی نے کہا: کیوں نہیں، ایک صحیح روایت ہے۔ پھر امام اوزاعی نے زہری عن سالم عن أبیہ کی سند سے یہ روایت پیش کی کہ حضور ﷺ نماز شروع کرتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کرتے تھے۔ اس کے جواب میں امام صاحب نے حماد عن ابراہیم عن علقمہ واسود عن عبداللہ بن مسعود کی سند سے یہ روایت بیان کی کہ حضور ﷺ صرف نماز شروع کرتے وقت ہی رفع یدین کرتے تھے۔ امام اوزاعی کہنے لگے کہ میں آپ کو زہری عن سالم عن أبیہ عبداللہ بن عمر کے حوالے سے روایت بیان کرتا ہوں اور آپ حماد عن ابراہیم کے حوالے سے؟ امام صاحب نے جواب دیا کہ حماد زہری سے زیادہ فقیہ ہیں، ابراہیم سالم سے فقاہت میں بڑھے ہوئے ہیں اور علقمہ بھی فقاہت میں حضرت ابن عمر سے کم نہیں، اور اگر ابن عمر کو صحبت کا شرف حاصل نہ ہوتا تو میں کہتا کہ علقمہ فقاہت میں حضرت ابن عمر سے بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر امام اوزاعی خاموش ہو گئے۔

۲۔ حضرت سفیان بن عیینہ نے امام صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ یہ فتوی دیتے ہیں کہ دو معاملہ کرنے والوں کو خیار حاصل نہیں ہوگا جب وہ ایک بیع سے فارغ ہو کر دوسری بیع میں لگ جائیں اگر چہ ایک ہی جگہ رہیں، تو امام صاحب نے کہا کہ ہاں۔ حضرت سفیان نے کہا کہ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں جب کہ حضور پاک علیہ السلام سے صحیح حدیث مروی ہے کہ بائع اور مشتری کو اس وقت تک خیار حاصل ہوگا جب تک کہ وہ جدا نہ ہوں۔ امام صاحب نے پوچھا کہ یہ بتایئے کہ اگر وہ دونوں کسی کشتی میں یا کسی جیل میں یا کسی سفر میں ہوں تو کس طرح جدا ہوں گے؟ اور کیا ان کو خیار حاصل ہوگا؟

ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اس جگہ امام صاحب نے حدیث کا انکار نہیں کیا؛ بلکہ حدیث سے تفرق بالابدان کی بجائے، تفرق بالاقوال مراد لیا۔

سرسری نظر سے دیکھنے والا سمجھے گا کہ امام صاحب نے حدیث کی مخالفت کی ہے؛ لیکن ذرا غور سے دیکھیے تو حقیقت کھلے گی کہ امام صاحبؒ نے تو حدیث کا صحیح مفہوم بتایا ہے۔

۳۔ ابن ابی شیبہ نے جو ایک سو پچیس حدیثیں پیش کی ہیں جن میں ان کے خیال کے مطابق امام ابو حنیفہ نے اپنی رائے کو ترجیح دی ہے، ان میں ایک حدیث یہ ہے کہ محمد بن نعمان بن بشیر کہتے ہیں کہ ان کے والد نعمان نے انھیں ایک غلام ہبہ کیا، پھر حضور پاک علیہ السلام کے پاس آئے؛ تا کہ آپ کو گواہ بنا سکیں۔ آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے اپنی سب اولاد کو غلام ہبہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر اسے بھی واپس لے لو۔ ابن ابی شیبہ نے اس روایت کے دو طریق اور بھی ذکر کیے ہیں جن میں الفاظ کا کچھ اختلاف ہے۔

اس میں امام صاحب پر یہ الزام لگایا ہے کہ حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ ہدیہ اور عطیہ اپنی سب اولاد کو برابر دینا چاہیے اور حدیث کے الفاظ سے اس کا وجوب ثابت ہوتا ہے، مگر امام ابو حنیفہ نے اسے استحباب پر محمول کیا ہے، اور اس طرح حدیث کو چھوڑ دیا ہے۔

علامہ کوثری کے الفاظ میں جو انھوں نے "النکت الطریفة" میں کہا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ: ''روایتوں کے الفاظ مختلف ہیں۔ کسی نے استحباب پر محمول کیا اور کسی نے وجوب پر۔ استحباب مراد لینے والوں میں امام ابو حنیفہ منفرد نہیں؛ بلکہ جمہور آپ کے ساتھ ہیں، جن میں امام مالک، لیث بن سعد، ثوری، امام شافعی وغیرہ حضرات شامل ہیں۔ وجوب

مراد لینے والوں میں ابن مبارک، امام احمد اور ظاہریہ ہیں۔ بیہقی نے دس وجوہات ذکر کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اولاد کو ہدیہ دینے میں برابر سمجھنے کا حکم استحباب پر محمول ہے۔ قاضی عیاض کی بھی یہی رائے ہے۔ یہاں امام ابو حنیفہ کی طرف سے زیادہ دفاع کرنے کی بھی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ اس مسئلے میں آپ منفرد نہیں؛ بلکہ جمہور فقہا آپ کے ساتھ ہیں۔ اور اس مسلک کی تائید صحابہ کے عمل سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ امام شافعی کی صراحت کے مطابق حضرت ابو بکر نے حضرت عائشہ کو اور حضرت عمر نے حضرت عاصم کو عطیہ دیا اور دیگر اولاد کو ان سے کم دیا۔

اسی طرح کی روایات پیش کر کے ابن ابی شیبہ نے امام ابوحنیفہ پر حدیث کی مخالفت کا الزام لگایا ہے، جس کی حقیقت گزر چکی۔ یہ بھی جاننا بہتر ہوگا کہ جن مسائل میں امام ابوحنیفہ پر حدیث کی مخالفت کا ابن ابی شیبہ نے الزام لگایا ہے ان میں اکثر مسائل میں امام صاحب منفرد نہیں ہیں؛ بلکہ کوئی نہ کوئی دوسرا امام؛ بلکہ بعض مسائل میں چند ائمہ آپ کے ہم خیال ہیں۔

امام ابوحنیفہ کا علمی حلقہ:

امام ابوحنیفہ کا اجتہاد واستنباط کے سلسلے میں جو طرز عمل تھا، اسے ذہن میں رکھ کر مذکورہ بالا الزامات درست ہو ہی نہیں سکتے۔ ابن ابی العوام نے ذکر کیا ہے کہ مغیرہ بن حمزہ کہتے ہیں: امام ابوحنیفہ کے جن شاگردوں نے کتابیں یعنی مسائل مدون کیے وہ چالیس تھے، جو ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ اور ان دس لوگوں میں جو زیادہ خاص تھے ابو یوسف، زفر، داؤد طائی، اسد بن عمرو، یوسف بن خالد، یحیی بن زکریا وغیرہ تھے۔ یہ یحیی وہی ہیں جو تیس سال تک مسائل لکھتے رہے۔

ابن ابی العوام نے اسد بن فرات کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب کسی مسئلے کے جواب میں اختلاف کرتے اور ہر ایک اپنا جواب پیش کرتا، پھر امام صاحب اپنا جواب پیش کرتے، پھر تین دن انتظار کرتے اور پھر اس کے بعد جو زیادہ مناسب ہوتا، اسے رجسٹر میں نوٹ کر لیتے۔

یحیی بن معین نے "معرفة التاريخ والعلل" میں فضل بن دکین سے نقل کیا ہے کہ میں نے زفر کو کہتے ہوئے سنا کہ ہم امام ابو حنیفہ کے پاس آتے تھے اور ہمارے ساتھ ابو یوسف اور محمد بھی ہوتے، اور آپ کی رائے ہم لکھ لیا کرتے، تو ایک دن امام صاحب نے ابو یوسف سے کہا کہ سب کچھ مت لکھا کرو؛ کیوں کہ میری رائے بدلتی رہتی ہے۔

موفق مکی نے کتنا سچ کہا ہے اور اوپر ذکر کردہ تفصیل سے اس کی حقیقت مزید آشکار ہوتی ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مسلک شورائی ہے۔ آپ نے تن تنہا اجتہاد نہیں کیا؛ بلکہ پوری ٹیم کی اجتہادی کوششوں سے یہ مسلک وجود میں آیا۔

خطیب بغدادی نے کیا خوب لطیفہ بیان کیا ہے کہ ابن کرام کہتے ہیں: ''ایک دن ہم وکیع کے پاس تھے تو ایک شخص نے کہا کہ ابوحنیفہ نے غلطی کی۔ وکیع کہنے لگے کہ ابوحنیفہ کیسے غلطی کر سکتے ہیں؛ کیوں کہ ان کے پاس ابو یوسف اور زفر جیسے قیاس کے ماہرین، یحیی بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، حبان اور مندل جیسے حفاظِ حدیث، قاسم بن معن جیسے ماہرین زبان اور داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسے زاہد و پرہیز گار موجود ہیں۔ اگر ان سے غلطی ہوگی تو یہ حضرت ٹوک دیں گے''۔

وکیع کی اس بات سے اتفاق ضروری نہیں کہ ابو حنیفہ غلطی نہیں کر سکتے؛ لیکن اس میں کیا شک ہے کہ امام ابوحنیفہ جیسا امام جس کے پاس اتنے عظیم شاگرد ہوں، جس کا زمانہ صحابہ سے قریب ہو اور جس کو اللہ رب العزت نے ذہنِ رسا اور مجتہدانہ عقل عطا کی ہو، اس پر اس طرح کے الزامات لگانا سراسر ظلم وزیادتی ہے۔ ان الزامات کا سلسلہ آپ کے زمانے سے شروع ہوا اور فتنۂ خلق قرآن کے دربار میں انتہا کو پہنچ گیا اور یہ سب انتقاماً ہوا؛ اس لیے کہ معتزلہ زیادہ تر امام صاحب

کے مسلک کے ماننے والے تھے اور انھوں نے محدثین پر طرح طرح سے ظلم کیے تھے، بدلے میں محدثین نے امام ابوحنیفہ پر ہی اس طرح کے الزامات لگانا شروع کردیے۔ خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ: ''ابوحنیفہ، ابو یوسفؒ، محمدؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے دوسرے شاگردوں میں سے کسی نے بھی قرآن کے بارے میں (اپنی رائے سے) کلام نہیں کیا۔ قرآن میں کلام تو بشر مریسی اور ابن ابی داؤد نے کیا۔ اور انھی لوگوں نے اصحاب ابو حنیفہ پر عیب زنی کی''۔

انصاف کی بات:

جی چاہتا ہے کہ یہاں آکر حافظ ابن عبدالبر نے ''جامع بیان العلم'' میں جو کچھ لکھا ہے، اسے پیش کردیں:

''محدثین نے ابوحنیفہ کی مذمت میں حد سے تجاوز کیا ہے۔ اس کی وجہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ ابوحنیفہ اخبار وآثار پر قیاس اور رائے کو ترجیح دیتے ہیں، جب کہ اکثر اہل علم کا ماننا یہ تھا کہ حدیث کی موجودگی میں قیاس کوئی چیز نہیں؛ لیکن آپ جن اخبار وروایات کو رد کرتے تھے ان کی کچھ تاویل کرتے تھے، اور بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ جو آپ کی رائے تھی وہی اس مسئلے میں پہلے بعض متقدمین کی بھی رائے تھی، اور پھر آپ کی رائے منفرد نہیں ہوتی تھی، جب کہ دوسرے اصحاب رائے بھی آپ کے موافق ہوتے تھے۔ آپ کے اکثر اقوال ایسے ہیں جو ابراہیم نخعی اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں کی آرا سے موافقت کرتے ہیں۔ ہاں یہ بات ہے کہ امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب نے نوازل اور فرضی مسائل میں قیاس واستحسان سے خوب کام لیا اور ان کے جوابات دیے، جس کی وجہ سے سلف سے بڑا اختلاف ہوا، جسے ان لوگوں نے بدعت سمجھا (یہ ابن عبدالبر کی ذاتی رائے ہے) اور کوئی بھی ایسا صاحب علم نہیں ہے جس نے کسی بھی حدیث کی تاویل نہ کی ہو، اور کسی روایت کی وجہ سے دوسری روایت کو ترک نہ کیا ہو، مگر ابوحنیفہ کے یہاں یہ چیز زیادہ ہے اور دوسروں کے یہاں کم۔ (یہ ابن عبدالبر کی ذاتی رائے ہے)''۔

لیث بن مسعود کے مطابق امام مالک نے جن احادیث کی مخالفت کی ہے، انھیں شمار کرانے کے بعد ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

''علمائے امت میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ اس کے سامنے صحیح حدیث رسول پیش کی جائے اور وہ اسے رد کردے۔ اگر کسی نے ایسا کیا ہے تو یہ اس وجہ سے کہ اس کے نزدیک وہ حدیث منسوخ تھی، یا اس کی سند میں کچھ طعن تھا۔ ورنہ ایسے شخص کو امام بنانا تو کجا، اس کی عدالت ہی ساقط ہوجاتی ہے، اور وہ فسق سے متہم ہوجاتا ہے۔ لوگوں نے امام ابوحنیفہؒ پر مرجیہ ہونے کا الزام لگایا ہے (جو غلط ہے)، حالانکہ بعض دیگر حضرات کو بھی مرجیہ کہا گیا، مگر ان کے بارے میں تنقیدی اور مذمتی اقوال بیان کرنے پر کسی نے توجہ نہ کی۔ امام ابوحنیفہؒ کی امامت کی وجہ سے آپ کے بارے میں لوگوں نے ایسے اقوال خوب نقل کیے؛ لیکن یہ بات بھی تھی کہ امام صاحب سے حسد کیا جاتا تھا اور جھوٹی باتیں آپ کی طرف منسوب کردی جاتی تھیں، حالانکہ علما اور اصحاب فضل کی ایک بڑی جماعت نے آپ کی تعریف بھی کی ہے۔

علما کے تعریفی اقوال نقل کرنے کے بعد ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

''کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کی عظمت کا اندازہ اس کے زمانے کے لوگوں کے متضاد بیانات سے ہوتا ہے۔ کیا حضرت علی کے بارے میں دو جماعتیں ہلاک نہیں ہوئیں: حد سے زیادہ محبت کرنے والے اور بغض وحسد کرنے والے؟ حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ حضرت علی کے بارے میں دو طرح کے لوگ ہلاک ہوں گے: حد سے زیادہ محبت کرنے والے، اور جھوٹی نفرت اور حسد کرنے والے۔ ہر دین دار، شریف اور صاحبِ علم وفضل کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ واللہ اعلم''۔

(السنة و مكانتها فى التشريع الاسلامى)

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

سزا

تلخیص و ترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

سزا کے بارے میں لوگوں کی رائیں مختلف ہیں، چنانچہ ایک نظریہ سزا کو درست سمجھتا ہے، جبکہ دوسرا نظریہ سزا کا مخالف ہے، کچھ لوگ سزا سے متعلق تحفظات رکھتے ہیں، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ نفسِ مسئلہ میں غور وخوض سے پہلے ہم کو اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے ''کہ ہم بچے کو سزا کیوں دیتے ہیں؟''۔

اکثر و بیشتر بچے کو سزا درج ذیل امور کے سبب دی جاتی ہے:

۱- کوئی حکم پورا نہ کرنے پر اس کو سزا دی جاتی ہے۔

۲- مستقبل میں کسی نامناسب کام سے روکنے کے لیے اس کو سزا دی جاتی ہے۔

۳- کبھی بچے کے کوئی کام کرنے یا نہ کرنے سے ہم کو جو پریشانی ہوتی ہے اور جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اس کی تسکین کے لیے اسے پر سزا دی جاتی ہے۔

کچھ والدین جو بہت صراحت سے کام لیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے بچے کو ان تینوں اسباب کی بنا پر مارا ہے، بعض کہتے ہیں کہ انھوں نے اس دوسرے سبب سے سزا دی ہے تا کہ بچہ اپنی غلطیوں سے سیکھ سیکھے، لیکن ساتھ ہی لوگ تیسرے سبب کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ دراصل ہم اس قدر پریشان ہو گئے کہ سزا دینے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہ بچا، بلکہ بعض والدین تو جب اس کا اعتراف کرتے ہیں تو شرمندہ بھی ہوتے ہیں، بہت سے والدین یہ چاہتے ہیں کہ وہ بچے کو کوئی تکلیف نہ دیں، اگرچہ اس پر طویل وقت تک عمل کرنا ممکن نہیں ہے، البتہ جس طرح سزا بھی سب سے زیادہ مار پیٹ کی شکل میں ہوتی ہے اسی طرح سزا کے اسباب میں زیادہ تر دوسرا سبب سزا کی وجہ بنتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا اسباب میں سے پہلے اور تیسرے سبب کا سزا میں کیا کردار ہوتا ہے؟

بلاشبہ کسی وقت پریشان ہونا، غصہ آنا اور صورت حال سے مغلوب و متاثر ہونا بشری خصوصیات ہیں، بالخصوص اس وقت جبکہ بچہ ماں یا باپ کے صبر کا پیمانہ بالکل لبریز کر دے، اگر آپ اپنے اعصاب پر قابو کھو دیں اور غصہ میں بچے کو سزا دے ڈالیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ ناکام باپ یا ناکام ماں ہیں، پھر یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آپ خود پر غصہ کریں، خود کو ملامت کریں اور گنہگار ٹھہرائیں، اور پھر ایسا نہ ہو کہ جو سزا آپ نے دی ہے اس کے عوض میں آپ اس پر ہدایا

وتحائف کی بارش شروع کر دیں، نہ یہ مطلب ہے کہ بچے نے غصہ دلانے والی جو حرکت کی اس سے آپ بالکل انجان بن جائیں کہ گویا اس نے کچھ کیا ہی نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ آپ بعض سوالات پر غور کرتے ہوئے معاملہ کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھیں۔

درحقیقت ہوا کیا؟ معاملہ کیسے شروع ہوا؟ کیا آپ غصہ اور شدت جذبات کی حالت میں تھے؟ کیا بچے نے دن بھر پریشان کیا، دن بھر شور شرابہ کرتا رہا؟ کیا آپ نے محسوس کیا کہ بچہ آپ کی نافرمانی کرنا چاہتا تھا اور آپ کو پریشان کرنا چاہتا تھا؟ کیا آپ کچھ کام نمٹانا چاہتے تھے اور وہ کام کرنے میں رکاوٹ بن رہا تھا، رکاوٹ بن رہا تھا؟ کیا آپ نے محسوس کیا کہ وہ آپ کی پدرانہ حیثیت کو چیلنج کر رہا تھا؟ پھر آپ نے جو بھی محسوس کیا، وہ کیسے محسوس کیا؟

اگر سزا دینے میں تیسرا مقصد کارفرما ہے، یعنی تسکینِ جذبات اور غصہ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے سزا دی جارہی ہے، تو آپ بچے کو سزا دیتے ہوئے اپنے ردعمل کو دیکھیں اور جائزہ لیں، اس لیے کہ بعض والدین یہ انکشاف بھی کرتے ہیں کہ انھوں نے بچے پر صرف غصہ نہیں نکالا بلکہ انھوں نے اس سے کچھ انتقام بھی لیا اور ان کو کچھ تشفی بھی ہوئی، ہمیں یہ سن کر سخت تعجب ہوتا ہے اور تکلیف محسوس ہوتی ہے، البتہ اس پر ہم کو تعجب نہیں ہوتا کہ بعض والدین بہت زیادہ غصہ میں آکر اور جذباتی ہوکر بچے کو سزا دیتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ موضوع بہت اہم اور حساس ہے اور ہم سب کو اس سے سابقہ پڑتا ہے، انسان فطری طور پر اپنے دفاع کے لیے جلدی کرتا ہے جبکہ اس کو دوسروں کی طرف سے دھمکی دی جاتی ہے، بلاشبہ بعض بچے جو اپنے والدین کی نافرمانی کرتے ہیں وہ گویا ان کو چیلنج کرتے ہیں اور بعض والدین کے لیے حقیقی معنیٰ میں یہ بڑا چیلنج ہوتا بھی ہے، البتہ یہ کوئی جسمانی اور مادی چیلنج نہیں بلکہ نفسیاتی چیلنج ہوتا ہے، چنانچہ والد اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں: ''میں اس چھوٹے سے بچے پر غلبہ (قابو) کیسے نہیں حاصل کرسکتا؟''۔

اس وقت معاملہ مزید سنگین ہوتا ہے جبکہ آپ صبر کرتے ہیں اور اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں مگر بچہ نہ صرف آپ کی کوششوں کی پروا نہیں کرتا بلکہ اس کا اسے اندازہ بھی نہیں ہوتا، وہ مزید پریشان کرنے اور ستانے کی کوشش کرتا ہے، مزید چیلنج کرتا ہے، اسی کشمکش میں بالآخر والد صبر کا دامن چھوڑ دیتے ہیں اور غصہ میں آکر بچے کو سزا دیتے ہیں، لیکن پھر والد کو خطا کا احساس ستانے لگتا ہے کہ انھوں نے صبر کا دامن چھوڑ کر بچے کو سزا دے ڈالی، ساتھ ہی والد کو یہ احساس بھی دامن گیر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ بچے کو قابو نہ کرسکے بلکہ حکمت کے ساتھ اپنے اعصاب پر قابو پانے میں بھی ناکام رہے۔

اکثر و بیشتر ہمارے معاشروں کا مزاج یہ ہے کہ جب چیلنج یا سرکشی کا معاملہ پیش آتا ہے تو عام طور پر اس کا جواب مار پیٹ اور جسمانی تشدد سے دیا جاتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس سے تنازعہ کے حل میں کوئی مدد نہیں ملتی بلکہ مشکلات میں مزید اضافہ ہوتا ہے، ہم کو اپنے آپ پر قابو پانے کی بڑی ضرورت ہے تاکہ اس کشمکش و زیادتی یا مار پیٹ میں ہماری اندرونی چاہت کا کوئی دخل نہ ہو، بلکہ ہم معاشرے کی قانونی و اخلاقی اقدار و ثقافت سے ہم آہنگ ہوسکیں جو کہ ہم سے یہ مطالبہ کرتی ہیں کہ ہم اپنے جذبات کے ساتھ مار پیٹ سے ہٹ کر دوسرے طریقوں سے تعامل کریں۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ بہت سے کثیر آبادی

والے معاصر معاشروں کی یہ خصوصیات ہیں کہ ان میں کشمکش اور جھگڑوں کے اسباب زیادہ پائے جاتے ہیں، ان میں مصالح کا ٹکراؤ ہوتا ہے، حتی کہ ایک ہی فیملی میں بھی یہ نوعیت پائی جاتی ہے، ہمارے آباء واجداد کی زندگی اس طرح گذرتی تھی کہ گھر بڑے ہوتے تھے، زمین میں وسعت تھی، ان کے گھر کے باہر کے کام زیادہ ہوتے تھے اور گھر کے اندر کم، مادی اعتبار سے اگر چہ ان کی زندگیوں میں تنگی اور پریشانی ہوتی تھی مگر آج کے بالمقابل کشمکش اور جھگڑے کے اسباب اس وقت کم تھے، یہی حال گھر کے اندر اولاد کا تھا، آج کی بہ نسبت اس وقت گھر کے اندر اصول وضابطے کم ہوتے تھے، چنانچہ گھر کے اندر بچوں کے سامنے اس طرح کے اثاثے بہت کم ہوتے تھے جو ٹوٹنے والے ہوں، ایسے تکیے اور کُشن وغیرہ کم ہوتے تھے جن کے خراب اور گندے ہونے کا خوف ہو، نہ ہی اس طرح کے بجلی کے قمقمے ہوتے تھے جو ساری رات سونے ہی نہ دیں، زیادہ تر سب لوگ ساتھ رہتے اور رُوبرُو وقت گذارتے تھے، ٹیلی ویژن پروگرام تھے ہی نہیں جو جھگڑے کا سبب بنیں، نہ اس طرح کے کھیل تھے جو باعث کشمکش واختلاف بنتے ہیں، اس لیے آپ کی یہ کوشش فائدہ مند ہوگی کہ آپ گھر کے اندر جھگڑے اور اختلاف وتنازعات کو جنم دینے والے کچھ اسباب وعوامل کو ختم کریں، یا کم از کم تمام امور کو کچھ اس طرح مرتب کریں کہ اختلاف وتنازع کا احتمال کم سے کم ہو۔

پہلے مقصد یعنی بچہ اگر کوئی کام نہ کرے تو اس کی خاطر اس کو سزا دینے میں بعض لوگوں کو اطمینان نہیں ہوتا، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اس میں بچے سے انتقام کا اسلوب شامل ہوتا ہے، اور فطری طور پر تنازعات کے حل کے لیے انتقام بالکل بھی مفید نہیں ہے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ ایسے اسباب وحالات کا ہی ازالہ کردیا جائے جو کشمکش وتنازع کا سبب بنتے ہیں، تاکہ سزا کے مناسب اور بہتر طریقہ کے بارے میں سوچنے کا کوئی سبب ہی باقی نہ رہے۔

اگر آپ بچے کو اس لیے سزا دے رہے ہیں تاکہ اس کو احساس ہو کہ وہ اپنی خطا کی قیمت چکا رہا ہے، تو اس کے برتاؤ اور رویّے کو بہتر بنانے کا یہ طریقہ بڑی حد تک غیر مفید ہوگا، بلکہ اس میں اس طریقہ سے بہتری آنے کا امکان بہت کم ہوگا، البتہ اس کے برعکس سزا کی وجہ سے آپ دیکھیں گے کہ بچے کے اندر اپنے لیے انتقام اور مزید سرکشی ونافرمانی کے جذبات بھڑکیں گے، اس سے اس کے اندر یہ شعور نہیں پیدا ہوگا کہ وہ سزا کے اسباب اور اپنے سلوک وتصرفات میں خطا پر غور کرے۔

جب آپ بچے کو سزا دیں تو اچھی طرح غور کرلیں کہ سزا انتقاماً نہ ہو، نہ ہی بچے کے کسی کام کی جزا کے طور پر ہو، بلکہ سزا محض بچے کی تفہیم اور سلوک کی بہتری کے لیے ہو، ورنہ آپ دیکھیں گے کہ سزا کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، بچے کو سمجھانے اور سکھانے کے بہت سے بہتر طریقے ہیں جن سے نہ صرف اس کی رہنمائی ممکن ہے بلکہ ان سے آپ کے اور اس کے تعلقات میں خلیج پیدا ہونے کے بجائے مزید بہتری اور مضبوطی پیدا ہوگی۔

البتہ جب ''ہلکی پھلکی سزا'' ہی ناگزیر ہو تو پھر سزا کیا ہونی چاہیے، بہتر ہے کہ یہاں اس کی شکلوں اور کچھ احتمالات پر گفتگو کی جائے۔

۱- مارنا/طمانچہ رسید کرنا:

منہ پر یا ہاتھ پر تھپڑ مارنے کے سلسلہ میں لوگوں کے نقطہائے نظر میں اختلاف ہے، بعض لوگ اس کو تادیب و تربیت کا ذریعہ سمجھتے ہیں، بعض لوگ اس کو انسان کی تذلیل کا طریقہ سمجھتے ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تھپڑ رسید کرنے

کے مثبت فوائد ہیں اور یہ فوری و وقتی ذریعہ ہوتا ہے، اس کو استعمال کرنے کے لیے بہت زیادہ وقت کی ضرورت نہیں ہوتی، البتہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے منفی اثرات مثبت پہلوؤں سے زیادہ ہیں، بچہ جہاں اس سے یہ سیکھتا ہے کہ بڑا چھوٹے کو تھپڑ رسید کرسکتا ہے، وہیں اس تھپڑ سے اس کو جو تکلیف پہنچتی ہے اس کے نتیجہ میں وہ حقیقت میں والدین سے ڈرنے لگتا ہے، والدین سے اس کا جذباتی تعلق کمزور ہو جاتا ہے، اگر آپ نے تھپڑ مارنے کا طریقہ اپنا رکھا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ جلد ہی آپ کا بچہ اپنے سے چھوٹوں پر یہ طریقہ آزمانے لگے گا، مارنے سے بچے کو حقیقی طور پر جسمانی نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ یہاں مجھے یہ نصیحت کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ چہرے، سر اور گردن پر نہیں مارنا چاہیے، اسی طرح ڈنڈے وغیرہ سے پٹائی نہیں کرنا چاہیے۔

جن چیزوں سے چھوٹے سے بچے کو واقعی کوئی جسمانی تکلیف پہنچ سکتی ہے، وہ یہ کہ مثلاً چھوٹے سے بچے کو اٹھا کر بہت تیزی سے جھٹک دیا جائے، سر میں زور کے جھٹکے سے دماغی تکلیف ہونے کا خطرہ رہتا ہے، یہاں میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بعض لوگ ایسا کرتے ہیں اور یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ ہمارے اس عمل سے بچوں کو ہمارے تصور سے زیادہ تکلیف پہنچ سکتی ہے، اب اگر کسی وقت مارنے کی ہی نوبت آ جائے تو بہت آرام سے معتدل انداز میں پنڈلی پر، بازو پر یا ہاتھ پر مارا جائے، جب آپ مارنے کا طریقہ اپنائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ رفتہ رفتہ یہ آپ کی عادت بنتی جائے گی، ظاہر ہے کہ مارنے میں احتیاط اس سے بہتر ہوگا کہ آپ بعد میں بیٹھ کر سوچیں کہ یہ کیا ہوگیا، اب اس کے درد کو دور کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے، بچہ رفتہ رفتہ اس کا عادی ہوجائے گا کہ جب بھی وہ کوئی نیا کام کرے گا تو ساتھ میں اسے آپ کے تھپڑ کی توقع ہوگی، پھر وہ آپ کی بات پر توجہ نہیں دے گا، وہ آپ کی طرف اس نظر سے دیکھے گا کہ آپ اس سے جو بھی کرانا چاہیں گے اس کے لیے آپ تشدد اور سختی کا سہارا لیں گے، پھر ایک مرحلہ ایسا آئے گا کہ جب تک آپ مار پیٹ کا سہارا نہیں لیں گے وہ آپ کی بات پر کوئی توجہ ہی نہیں دے گا، پھر بچہ اگر متشدد اور سرکش ہوگیا تو اس پر ان سب چیزوں کا کوئی اثر ہی نہیں ہوگا، پھر آپ کے سامنے اس کی تربیت و پرورش کا کیا طریقہ رہ گیا؟

۲- بچے کو سونے بھیج دینا:

بعض لوگ بچے کے لیے بیڈ روم بھیجنے کا طریقہ استعمال کرتے ہیں، یعنی جب بھی وہ غصہ ہوتے ہیں یا بچہ کوئی نامناسب کام کرتا ہے تو فوراً اس سے کہتے ہیں اپنے بستر پر جا کر سو جاؤ، بعض لوگ اس کے منفی اثرات کے قائل ہیں، چنانچہ بچہ بیڈ روم اور بستر کو سزا کے ذرائع اور محرومی کے اسباب میں شمار کرسکتا ہے، اگر اس کے ذہن میں بستر اور بیڈ روم کے متعلق یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ تو محرومی کے اسباب و ذرائع ہیں تو پھر وہ رات کو سونے جانے سے گریز کرے گا، پھر وہ دیر تک بیڈ روم سے دور رہنے اور ادھر ادھر کھیلنے کی کوشش کرے گا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب بچے کو یہ احساس ہو کہ آپ اس سے غصہ ہیں، تو پھر اس کو اس کی بھی سخت ضرورت ہوتی ہے کہ اس وقت بھی اسے یہ اطمینان رہے کہ آپ اس سے اب بھی محبت کرتے ہیں، اگرچہ آپ اس کو خود سے دور کر رہے ہیں اور سونے کے لیے کمرے میں بھیج رہے ہیں، یہ اچھی بات نہیں ہے کہ بچہ یہ سمجھے کہ جب اس کو پریشانی ہو تو اسے والدین سے دور الگ ہٹ کر تنہا رونا چاہیے اور اس کو

اپنی مشکلات اپنے گھر والوں کی مدد کے بغیر تنہا حل کرنی چاہیے، اس صورت میں بہتر یہ ہے کہ آپ کچھ وقت اسے اپنے پاس رکھیں تاکہ اس کو یہ نہ لگے کہ آپ اس کو بھگا رہے ہیں یا دھتکار رہے ہیں، یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ بچے کو تاریک کمرے میں نہ رکھا جائے، نہ ہی دروازہ پر قفل لگا کر اس کو قید کیا جائے اس لیے کہ کمرہ تاریک کرنے یا مقفل کرنے سے بچہ بہت زیادہ ڈر جائے گا، اور اس پر شدید قسم کا نفسیاتی خوف طاری ہوجائے گا جس کے اثرات بہت دنوں تک رہیں گے، اگرچہ ظاہری طور پر لگے لگا کہ وہ یہ واقعہ کچھ سالوں کے بعد بھول گیا، لیکن اس کے اثرات خوف، قلق اور تردّد کی صورت میں کبھی اس کی شخصیت میں اور کبھی اس کے مواقف میں ظاہر ہوں گے اور اہل خانہ اس کا سبب بھی نہ سمجھ سکیں گے۔

۳- بچے کو تحفے نہ دینا یا اس سے واپس لے لینا:

اس طریقہ کو بھی استعمال کرنے میں والدین کے نقطۂ نظر مختلف ہیں، اور بچوں پر اس کے اثرات بھی مختلف ہیں، چنانچہ جس بچے کو بہت زیادہ تحفے تحائف کی عادت ہوگی اس کو اس سے محروم کیا جائے گا تو بہت متاثر ہوگا، مثلاً آپ اس سے کہیں کہ ایک ہفتہ تک تم کو اپنے ساتھ بازار نہیں لے جاؤں گا، البتہ جس بچے کو ہنسی مذاق کی عادت ہوگی اس کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، ظاہری طور پر بھی وہ اس سے متاثر نہیں ہوگا بلکہ اس کو قبول کرے گا اور اسی حال میں رہنے کے لیے تیار ہوگا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بچے کے ساتھ ظلم ہے کہ محض اس کی غلطی یا کسی مشکل کے سبب اس کو کسی چیز کے حصول سے محروم کردیا جائے، ویسے بالعموم بھی اس طریقہ کو بہت زیادہ سزا کے لیے نہیں استعمال کیا جاسکتا، کیونکہ اس کی کثرت سے بچے کے اندر یہ احساس پیدا ہوسکتا ہے کہ اس کے آس پاس کے لوگ اور اردگرد کی دنیا میں استقرار اور ٹھہراؤ نہیں ہے، اس لیے اس پر اطمینان نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ عین اس وقت جب اس کو کسی چیز کی توقع ہو اور اسی چیز سے محروم کردیا جائے تو پھر بچہ نہ والدین کے وعدوں پر بھروسہ کرتا ہے اور نہ لوگوں کے، اس کے اندر بے اعتمادی کی کیفیت پیدا ہونی شروع ہوجاتی ہے، وہ اس حال میں بڑا ہوتا ہے کہ دوسروں سے کیے گئے وعدے وفا کرنے کا عادی نہیں ہوتا، وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ یہی دیکھتے دیکھتے بڑا ہوا ہے۔

اس طریقے کو استعمال کرنے کا بہتر انداز یہ ہے کہ یہ بچے کے کسی نامناسب برتاؤ اور غلطی کے فوراً بعد ایک لازمی اور فطری نتیجہ کے طور پر ظاہر ہو، مثلاً ماں بچے کو کوئی میٹھی چیز بنا کر دیتی ہے، لیکن بچے نے ماں کو پریشان کرنا شروع کردیا، گھر میں ہنگامہ شروع کردیا، جس سے ماں کو وہ چیز بنانے کا وقت ہی نہیں ملا، اس لیے اب بچہ اس سے محروم ہوگا، اور اس محرومی اور اپنے نامناسب رویہ میں وہ فطری اور لازمی ربط کو خود ہی واضح طور پر محسوس بھی کرے گا، اس کو بات سمجھ میں آئے گی کہ وہ اپنی کرتوت سے اس میٹھی چیز سے محروم ہوا ہے، اس میں نہ تو ماں کو ملامت کی جاسکتی ہے اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ماں نے ظلم کیا ہے، یہ بات ہمیشہ اہم ہے کہ بچہ اپنے غیر معاون سلوک اور ان نتائج کے درمیان ربط کو محسوس کرے جو اس کے رویّہ سے آس پاس کے لوگوں کی زندگی پر پڑتے ہیں، یہ بھی فائدہ سے خالی نہیں کہ آپ بچے کو سمجھائیں کہ اس نامناسب برتاؤ سے کیا نتیجہ ملا، کیا حاصل ہوا، اس کے سامنے وضاحت کریں کہ ''انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے''۔

☆☆☆

❑ تأثرات

اسلام کا بیٹا: ضیاء الرحمٰن

(ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی رحمہ اللہ کی رحلت پر ایک تاثراتی تحریر)

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

گزشتہ کچھ دنوں سے اساطینِ علم کی رحلت کی مسلسل موصول ہونے والی خبروں میں آج ایک دل دوز خبر کا اضافہ ہوگیا کہ مشہور محدث، مسجد نبوی میں حدیث کا درس دینے والے، حدیث کے ایک بڑے اور اہم پروجکٹ کو پائے تکمیل تک پہنچانے والے اور سرزمینِ ہند کے سپوت ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی ظہر کے وقت اللہ کو پیارے ہوگئے _ ان کی ایک انفرادیت یہ تھی کہ وہ پیدائشی مسلمان نہ تھے، بلکہ ان کا تعلق ضلع اعظم گڑھ کے قصبہ بلریا گنج کی ہندو فیملی سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت دی، اس کے بعد انھوں نے اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کر کے علم حدیث کے میدان میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کی زبردست خدمت انجام دی۔ انھوں نے تنِ تنہا اتنا عظیم الشان کام انجام دیا جو وافر سہولیات اور محققین کی بڑی ٹیم کے ساتھ اکیڈمیوں کے کرنے کا ہوتا ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا تعلق ایران کے ایک مجوسی خاندان سے تھا _ اسلام قبول کرنے کے بعد ان کی قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ غزوۂ خندق کے موقع پر مہاجرین کہتے تھے کہ سلمان ہمارے ایک فرد ہیں، انصار کہتے تھے کہ سلمان ہم میں سے ہیں۔ اس موقع پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سَلمانُ مِنّا اَهلَ البيت (الجامع الصغیر للسیوطی: 4680) ''سلمان تو ہمارے گھر کے آدمی ہیں''۔ علّامہ حافظ أبو نعیم الأصبہانی نے اپنی کتاب 'معرفۃ الصحابۃ' (9/283) میں لکھا ہے: ''سلمان فارسی کی نسبت اسلام کی طرف تھی۔ وہ اسلام کے بیٹے تھے''۔ اِسی طرح آج کے زمانے میں جب خاندانی نسبتوں پر فخر کیا جاتا ہے اور انہیں عظمت کی نشانی سمجھا جاتا ہے، ہم فخر کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا تعلق ہمارے ملک ہندوستان سے تھا اور چاہے ان کے حقیقی باپ کا نام معلوم نہ ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیوں کہ وہ اسلام کے بیٹے تھے۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن کی ولادت 1943ء میں ہندوستان کی ریاست اتر پردیش کے معروف ضلع اعظم گڑھ کے قصبہ بلریا گنج میں ایک ہندو گھرانے میں ہوئی۔ والدین نے ان کا نام بانکے رام رکھا۔ شبلی کالج اعظم گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں وہ بعض شخصیات کے رابطہ میں آئے، جس کے نتیجے میں اسلام کی نعمت سے مالا مال ہوئے _

دینی تعلیم کے حصول کے لیے جنوبی ہند کی مشہور درس گاہ جامعہ دار السلام عمر آباد چلے گئے، جہاں سے عالمیت اور فضیلت کی اسناد حاصل کیں_ اس کے بعد سعودی عرب تشریف لے گئے، جہاں الجامعۃ الاسلامیۃ المدینۃ المنورۃ سے گریجویشن اور جامعۃ الملک عبد العزیز مکۃ المکرّمۃ (موجودہ نام: جامعۃ أم القریٰ) سے پوسٹ گریجویشن کیا۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری جامع ازھر مصر سے حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ان کی پوری زندگی سعودی عرب میں گزری۔ ابتدا میں رابطہ عالمِ اسلامی مکہ مکرمہ میں مختلف مناصب پر فائز رہنے کے بعد انچارج ہیڈ آفس جنرل سکریٹری رابطۃ العالم الاسلامی رہے۔ 1399ھ/ 1979ء میں کلیۃ الحدیث، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں بطور پروفیسر متعین ہوئے۔ آپ نے عرصہ تک مسجدِ نبوی میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا درس دیا۔ درس وتدریس کے علاوہ آپ کا تصنیف وتالیف کا کام بھی بڑا قابل قدر ہے، آپ کی چند اہم کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

(1) أبو ہریرۃ فی ضوء مرویاتہ
(2) أقضیۃ رسول اللہ ﷺ
(3) دراسات فی الجرح والتعدیل
(4) المدخل إلی السنن الکبری للبیہقی
(5) دراسات فی الیہودیۃ والنصرانیۃ
(6) فصول فی أدیان الہند
(7) معجم مصطلحات الحدیث
(8) المنۃ الکبری شرح وتخریج السنن الصغری للبیہقی
(9) التمسک بالسنۃ فی العقائد والأحکام
(10) تحفۃ المتقین فی ما صح من الأذکار والرقی والطب عن سید المرسلین۔

ان کتابوں کو کئی ناشرین نے چھاپا ہے اور ان کے کئی ایڈیشن طبع ہوئے ہیں۔

آپ کا سب سے عظیم کارنامہ آپ کی تالیف 'الجامع الکامل فی الحدیث الصحیح الشامل' ہے۔ اس میں تمام صحیح احادیث کو مختلف کتبِ احادیث، مثلاً مؤطات، مصنفات، مسانید، جوامع، صحاح، سنن، معاجم، مستخرجات، أجزاء اور أمالی سے جمع کیا گیا ہے۔ ہر حدیث کی تخریج کے بعد اس کے صحیح اور حسن کا درجہ بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ قارئین کی سہولت کے لیے اس کتاب کو فقہی ابواب پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن دار السلام سعودی عرب سے 2016 میں 12 جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن 2019 میں دار ابن بشیر، پاکستان سے 19 جلدوں میں طبع ہوا ہے۔ (ان میں سے ایک جلد فہارس کی ہے) یہ کتاب سولہ ہزار پانچ سو (16500) صحیح حدیثوں پر مشتمل ہے۔

آپ کی متعدد کتابیں ہندی زبان ہیں، جن میں 'قرآن کی شیتل چھایا' اور 'قرآن مجید کی انسائیکلو پیڈیا' بہت مشہور ہیں اور ان کے بہت سے ایڈیشن منظرِ عام پر آئے ہیں۔

میری سعادت ہے کہ مجھے تقریباً تین برس قبل ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پر حاضری دینے، ان سے ملاقات کرنے اور کچھ دیر ان کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ اس کی تقریب یوں ہوئی کہ 2017 کے اواخر میں مجھے اور میرے ہم زلف مولانا جبریل امین صدیقی فلاحی کو اپنی اپنی فیملی کے ساتھ عمرہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے پوری رازداری برتی کہ احباب کو میرے سفر کا علم نہ ہو پائے، تاکہ حرمین میں پورے سکون کے ساتھ زیادہ سے زیادہ عبادت کرنے کا موقع

مل سکے۔ مکہ مکرمہ کی حد تک تو میں کام یاب رہا، لیکن مدینہ منورہ میں میرے عزیز دوست مولانا انس فلاحی سنبھلی کو، جو خود کو میرا شاگرد بتاتے ہیں، خبر لگ گئی۔ وہ ان دنوں جامعہ اسلامیہ کے طالب علم تھے۔ وہ ایک ہفتہ مسلسل سایے کی طرف میرے ساتھ لگے رہے، مقامات مقدسہ اور تاریخی آثار کی زیارت کروائی، تحریکی افراد اور غیر تحریکی شخصیات سے ملاقاتیں کروائیں۔ انھوں نے ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن سے بھی میری ملاقات کا اہتمام کیا، ان سے وقت لیا، مجھے ان کی رہائش گاہ تک پہنچایا اور برابر میرے ساتھ رہے۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن سے میری یہ ملاقات بہت یاد گار رہی۔ اس ملاقات میں مولانا جبریل امین صدیقی، مولانا طاہر مدنی کے صاحب زادے عزیزی عبد الرحمٰن اور عزیزی سعود اختر سنبھلی فلاحی بھی ساتھ تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارا پُر تپاک استقبال کیا اور ہمیں اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا، جسے ڈرائنگ روم کے بجائے لائبریری کہنا زیادہ موزوں ہوگا، کیوں کہ اس میں بڑی بڑی الماریوں میں حدیثی مصادر ومراجع کے نئے نئے ایڈیشن بہت سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ان کی موجودہ مصروفیات کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے اپنی متعدد تالیفات دکھائیں۔ ان کی الجامع الکامل کا تذکرہ نکلا تو انھوں نے بتایا کہ دار السلام والوں نے اسے 12 جلدوں میں شائع کیا ہے۔ اس پر نظر ثانی کا کام کرلیا ہے۔ اگلا ایڈیشن 18 جلدوں میں شائع ہونے کی توقع ہے۔ یہ جان کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ ان کی بعض کتابیں ہندی زبان میں شائع ہوئی ہیں، جو بڑی مقبول ہیں۔ انھوں نے ہندی میں قرآن انسائیکلوپیڈیا کا تذکرہ کیا، جسے کئی ناشرین نے چھاپا ہے اور اس کے بہت سے ایڈیشن منظر عام پر آئے ہیں۔ میں نے ان سے تذکرہ کیا کہ بعض سائٹس پر آپ کو پاکستانی بتایا گیا ہے تو انھوں نے تعجب کا اظہار کیا۔ جماعت اسلامی ہند کی سرگرمیوں کے بارے میں انھوں نے جاننا چاہا۔ میں نے کچھ تفصیل بتائی تو اس پر بہت خوشی کا اظہار کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ہندوستان میں غیر مسلموں کے درمیان کام کرنے اور ہندو مسلم منافرت کے بڑھتے رجحان پر قابو پانے کی سخت ضرورت ہے۔

گفتگو کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا، اس میں وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ سوچا کہ مزید زحمت دینا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے اجازت لینے کا ارادہ کیا۔ مجھے اس پر حیرت ہو رہی تھی کہ اتنی دیر رہنے کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے کچھ کھلانے پلانے کا اشارہ تک نہیں کیا۔ قریب تھا کہ ہم لوگ رخصت ہونے کی اجازت لیں کہ اندر سے لذّتِ کام و دہن کے سامان برآمد ہونے شروع ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہم لوگوں کی ضیافت کے لیے خاصا انتظام کروایا تھا۔ ہم نے جی بھر کر کھایا، انھوں نے اصرار کر کے مزید کھلایا۔

آج ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی کی وفات کی خبر سن کر بہت صدمہ ہوا۔ بڑی بڑی علمی شخصیات جس تیزی سے اٹھ رہی وہ بڑی تشویش کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے، ان کی مغفرت فرمائے، انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین یارب العالمین!

☆☆☆

❑ گوشۂ ادب

قسط : ۱

ماہر القادریؒ کی نعتیہ شاعری کا منفرد بیانیہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

ماہر القادری (جولائی ۱۹۰۶ء-مئی ۱۹۷۸ء) دنیائے اردو کا ایک معتبر و معروف نام ہے، وہ ایک قادرالکلام شاعر، صاحب طرز ادیب، ماہر فرہنگ، بلند پایہ نقاد اور بااصول صحافی تھے، ان کی غزل گوئی اپنا منفرد مقام رکھتی ہے، ان کی تنقید بڑے بڑوں کا مقام متعین کرتی ہے، ان کا ''فاران'' صحافت کا معیار متعین کرتا ہے، اسلامی نظام، توحید، بدعات اور انکار حدیث پر ان کی حساسیت ان کی فکری سلامتی اور حمیت دینی کا پتہ دیتی ہے، جماعت اسلامی اور اردو کا دھاردار دفاع، ان دونوں سے ان کی بے پناہ محبت کی داستان سناتا ہے، اس کے علاوہ ان کی بے شمار خصوصیات ہیں جن کے ذکر سے ان کی شخصیت کا وزن معلوم ہوتا ہے، ان کا ہمہ جہت مطالعہ، ان کی وسیع النظری اور کشادہ قلبی، ان کی مؤثر ترین اور سحر طراز نثر نگاری، ان کی درجنوں کتابیں، ان کی علمی، ادبی، دعوتی اور صحافتی زندگی سب اپنی مثال آپ ہے، اشتراکیت کا مضبوط ترین تعاقب، ترقی پسند ادب کے زور کے باوجود ادب اسلامی کا فروغ ان کا کارنامہ ہے، ان کی تنقید کا خاص معیار بھی انھیں دوسروں سے ممتاز کرنے کے لیے کافی ہے، کون ہوگا جو خود پر بھی تنقید سے گریز نہ کرے، ماہر صاحب کا یہ بھی دلچسپ واقعہ ہے کہ کراچی سے نکلنے والا ایک رسالہ ''گردوپیش'' ان کے پاس تبصرے کے لیے بھیجا گیا، اس میں ان کی بھی ایک نظم چھپی تھی ''فاران'' میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ''ماہر القادری کی نظم میں ''نگاہ'' کو ''چشم'' کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے جو قابلِ غور ہے''۔ (فاران، اکتوبر ۱۹۶۵ء)

ان ساری خصوصیات و امتیازات کے باوجود ماہر صاحب کو جو چیز ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے، جہاں ان کا کوئی ہمسر و ہم پلّہ نظر نہیں آتا وہ ہے ان کی نعت گوئی، ماہر صاحب کی شاعری کا بیشتر حصہ نظموں پر مشتمل ہے، ان کی غزلوں میں بھی زندگی کا احساس اور مسائل حیات کی بھرپور ترجمانی ہے، ان کی غزلیہ شاعری ندرت و بانکپن اور اچھوتی تمثیلات و استعاروں کے سبب چونکائے اور اپنی طرف کھینچے بغیر نہیں رہتی، لیکن ان سب کے باوصف ان کی نعتیہ شاعری میں ان کی فنی مہارت عروج پر نظر آتی ہے، اخلاص کی شیرینی، جذبات کی صداقت و فراوانی، فنائیت و محبت اور وارفتگی کے ساتھ، فکر کی پاکیزگی اور ندرت خیال کی جھلکیاں ہر شعر میں نظر آتی ہیں، زبان و بیان پر بے پناہ قدرت کے سبب ان کی نعتیہ شاعری کا لہجہ و اسلوب منفرد و مخصوص نظر آتا ہے، ماہر القادری ادب کے زندگی سے گہرے تعلق پر یقین رکھتے تھے، مگر اس تعلق کے اظہار کی خاطر ادب و زندگی کے رموز اور رازہائے سربستہ سے واقفیت ضروری ہے، ماہر صاحب کو زندگی اور اس کے پہلوؤں کا حقیقی ادراک تھا، وہ ادب کا بھی حقیقی شعور رکھتے تھے، وہ زندگی کے کئی مراحل سے گزر کر اس

مقام تک پہنچے تھے جہاں سے وہ عالمانہ تنقید کرتے تھے، مبصرانہ اسلوب میں تجزیے کرتے تھے، امت کے انتشار پر کڑھتے تھے، نظریاتی جنگ میں حق کا دفاع کرتے تھے، اپنوں اور غیروں کے درمیان کشمکش کا مشاہدہ کرتے تھے، ایک طرف کمیونزم کا مقابلہ کرتے تھے تو دوسری طرف منکرین حدیث سے نمٹتے، تیسری جانب خود اپنے بھائیوں کے تیر ونشتر سہتے، ان سب کے ساتھ ادب میں بھی نظریاتی جنگ عروج پر تھی، ماہر صاحب ادب اسلامی کے داعی وعلمبردار تھے، اس طرح ان کی شاعری زندگی کا آئینہ اور پیغام رسانی کا طاقتور وسیلہ بن گئی تھی، چنانچہ انھوں نے نعتیہ شاعری کو بھی بڑی مہارت سے ترسیل پیغام اور تبلیغ دین کا آئینہ بنا دیا تھا۔

نعتیہ شاعری بدون فکر ومطالعہ نہ صرف بے روح ہو جاتی ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ اظہار عقیدت ومحبت کا ذریعہ رہ جاتی ہے، بلکہ بسا اوقات شاعر نعتیہ شاعری میں ایسے بے ہنگم معانی کو نظم کر دیتا ہے جس کی ضرب عقیدہ پر پڑتی ہے بلکہ کبھی کبھی شان رسالت مآب بھی مجروح ہوتی ہے اور سیرت رسول کا تقدس بھی مجروح ہو جاتا ہے، عقیدت میں جب وہ حد سے گذرتا ہے تو پھر توحید ورسالت کے درمیان کے باریک واہم فرق کو ملحوظ رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے اس لیے کہ اس مشکل اور ناہمواری سے بچنے میں فکر ومطالعہ کا بڑا دخل ہے۔

ماہر القادری ایک قادرالکلام شاعر تھے، وہ ایک صاحب فکر ومطالعہ عالم تھے، توحید پر وہ کسی طرح مصالحت نہیں کرتے تھے، سیرت رسولؐ سے انھیں عشق تھا، صاحب رسالت کا لایا ہوا دین ایک مکمل نظام حیات کی شکل میں ان کے سامنے تھا، اس لیے ان کی نعتیہ شاعری کا بیانیہ ایک منفرد رنگ اختیار کر گیا، اس میں اظہار محبت، ذات رسالت کی منقبت وعظمت بھی ہوتی، پیغام رسالت کا مؤثر بیان بھی ہوتا، سیرت واحادیث اور قرآنی ارشادات کی بھرپور ترجمانی ہوتی، مختلف واقعات منظوم ہو جاتے، منصب رسالت اور اس کے مقاصد کی ترجمانی ہوتی، دین کے کامل تصور کا بیان ہوتا، عظمت ومحبت کا اظہار ایسا ہوتا کہ بدن کانپ اٹھے، آنکھیں ڈبڈبائے بغیر نہ رہ سکیں، سیرت کی جامعیت اور دین کی کاملیت پر ایسی گفتگو ہوتی کہ ایک ایک شعر گھنٹوں کے خطبات پر بھاری پڑ جائے، کبھی ماہر صاحب کا لہجہ ایسا انقلابی ہو جاتا کہ پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا اور انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے، جی میں آیا کہ اس منفرد ومؤثر بیانیہ پر بساط بھر گفتگو کی جائے۔

اردو کے شعراء میں ''سلام'' کہنے کی روایت رہی ہے، ماہر صاحب نے بھی ایک سلام کہا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان کا سلام اردو ادب کی تاریخ میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی سلاست، تراکیب کی متانت، الفاظ کا رکھ رکھاؤ، اس کی تاثیر، اس کا بیانیہ، اس کی جامعیت وحلاوت وکیفیت، اس میں معانی کی فراوانی اور سیرت وکارِ نبوت کا بیان لاجواب ہے، زبان ایسی کہ دل میں اتر جائے، بیان ایسا کہ قلب کو گرما دے، راقم آثم کو یاد نہیں کہ اس نے کتنی بار اس سلام کو پڑھا اور سنا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہر مرتبہ ایک نئی لذت اور ایک نیا سرور ملتا ہے، خلوص وجذبہ کی یہی دلیل ہے کہ اس کی کارفرمائی کسی تحریر وشاعری کو پس مردہ نہیں ہونے دیتی، ہم یہاں پہلے اس مکمل سلام کو پیش کریں گے پھر کچھ اور نعتوں پر گفتگو کریں گے، **ہمیں خوب معلوم ہے کہ یہ ہمارا کوئی علمی کام یا ادبی کارنامہ نہیں ہوگا، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہماری اس کاوش سے اگر کسی زندگی میں تبدیلی آجائے، کسی کی فکر سنور جائے، کسی کو محبت رسول کی چاشنی مل جائے، کسی میں سیرت رسولؐ سے آشنائی کا شوق پیدا ہو جائے، کسی کے اخلاق میں انقلابی تبدیلی آجائے، کسی کے دل ودماغ پر حبّ رسول کا ٹھپہ لگ جائے یا کچھ نہیں تو اسے پڑھتے ہوئے حبیبِ خداؐ کی یاد میں آنکھیں ہی چھلک جائیں تو یہ میرے لیے بڑے نفع کا سودا ہوگا، میرا یہ مضمون محض فکر وخیال کی آبیاری اور ذہن وشعور کی بالیدگی اور روح کو تازگی وغذا فراہم کرنے کی خاطر ہے اور بس۔** ماہر صاحب کے اس سلام میں سیرت نگاری کا یہ نمونہ دیکھیے

سلام اسؐ پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی
سلام اسؐ پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

حضور اکرمؐ جس طرح دوسروں کے کام آتے تھے، مجبوروں اور معذوروں کی مدد کرتے تھے، یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں کے ملجأ وماوی بن جاتے تھے وہ ایک امر واقعہ ہے، نبوت سے قبل بھی آپ کی زندگی کے یہی اوصاف حمیدہ تھے، جب آپ پہلی وحی کے بعد گھبرائے ہوئے گھر آئے تھے تو اماں خدیجہؓ نے بھی ان ہی اوصاف کا ذکر کر کے آپ کی ڈھارس بندھائی تھی اور فرمایا تھا کہ ان کی بدولت اللہ آپ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا، ماہر صاحب نے پہلے مصرع میں اسی پہلو کی ترجمانی کی ہے، دوسرے مصرع میں آپ کی زندگی کا وہ پہلو پیش کر دیا جو اپنی مثال آپ ہے، کہ جب آپ ایک ریاست کے سربراہ بن گئے، بلکہ آپ تو تھے ہی شاہوں کے شاہ، آپ خواہش کرتے تو رب کریم دولت دنیا کی بوچھار فرما دیتے، مگر آپ نے تو بادشاہی کے ساتھ بھی بے نیازی و استغنا اور فقیری کا رنگ پیش کیا، ماہر صاحب اسی میں آگے فرماتے ہیں ؎

سلام اُس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا
سلام اُس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا

آپؐ کی بعثت سے قبل دنیا کس طرح باہم برسرِ پیکار تھی، رشتوں کا تقدس کس طرح پامال ہوتا تھا، بھائی بھائی کا خون کیسے پیتا تھا، شیر خوار بچے بھی والدین کی شفقتوں کو کیسے ترستے تھے، اس پورے گھناؤنے منظر نامہ اور بھیانک تاریخ کو ذہن میں رکھیے، پھر اعلان نبوت کے بعد مکہ مکرمہ میں آپ کو جس طرح ستایا گیا، طائف میں جس طرح لہولہان کیا گیا، جس طرح آپ پر بھپتیاں کسی گئیں اور جس طرح آپ کا مذاق بنایا گیا مگر آپ صبر واستقامت کا پہاڑ بنے رہے اور عفو و درگذر اور صبر و رضا کا کردار پیش کرتے رہے وہ سب ذہن میں رکھیے اور گنگنائیے ؎

سلام اسؐ پر کہ اسرارِ محبت جس نے سمجھائے
سلام اسؐ پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے
سلام اسؐ پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں
سلام اسؐ پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں

اور فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے جس بلند اخلاقی کا اسوہ پیش کیا اور ابوسفیان کی جس طرح عزت افزائی کی، اس کو ماہر صاحب کی بلیغ زبان میں ملاحظہ کیجئے ؎

سلام اسؐ پر کہ دشمنِ جاں کو حیاتِ جاوداں دے دی
سلام اسؐ پر ابوسفیان کو جس نے اماں دے دیں

قرآن نے خود نقل کیا ہے کہ حضرت محمدؐ کی آمد کی بشارت سارے صحائف میں دی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود نہ صرف اہل کتاب آپ کی عداوت میں پیش پیش رہے بلکہ آپ کے اپنے گھر خاندان کے لوگ آپ کے دشمن ہو گئے اور آپ کی ایذا رسانی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ؎

سلام اسؐ پر کہ جس کا ذکر ہے سارے صحائف میں
سلام اسؐ پر ہوا مجروح جو بازارِ طائف میں
سلام اسؐ پر وطن کے لوگ جس کو تنگ کرتے تھے
سلام اسؐ پر کہ گھر والے بھی جس سے جنگ کرتے تھے

لیکن پھر بھی یہ آپؐ ہی کا جگر تھا کہ آپ امت کے غم میں جان ہلکان کرتے تھے، خدا کو بھی آپ پر ترس آتا تھا اور وہ کبھی کبھی آپؐ کو تسلی دیتا تھا لعلك باخع نفسك علىٰ اٰثارهم إن لم يؤمنوا بهٰذاالحديث اسفا، آپ نے تمام تر مشقتیں اٹھا کر بھی کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، ہمیشہ دوسروں کی مدد کی، خود پیٹ پر پتھر باندھا اور دوسروں کے کھانے کا انتظام کیا، آج بات بات میں لڑنے پر آمادہ اور تعصب میں مبتلا اس امت کے افراد کے لیے سوچنے کا مقام ہے کہ ؎

سلام اسؐ پر کہ جو سچائی کی خاطر دکھ اٹھاتا تھا
سلام اسؐ پر جو بھوکا رہ کے اوروں کو کھلاتا تھا
سلام اسؐ پر جو امت کے لیے راتوں کو روتا تھا
سلام اسؐ پر جو فرشِ خاک پر جاڑے میں سوتا تھا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور آپ کی رحمت للعالمینی کو جس خوبصورت انداز میں نظم کیا ہے وہ ماہر صاحب کا ہی حصہ ہے، اس میں کیا شک کہ آپ دنیائے انسانیت کے لیے باعثِ فخر ہیں، آپ کو خدا تعالیٰ نے ساری مخلوقات اور سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا، آپ کی آمد کے بعد ہی تو انسان کو انسانیت کا سبق ملا، آپ نے اخلاق کریمانہ کا جو نمونہ پیش کیا، دنیا نے کب اس سے پہلے اس کا نظارہ کیا تھا، غلاموں کے جسموں میں آگ لگا کر اس کی روشنی میں امراء دعوتیں اڑاتے تھے، بے سبب جنگیں ہوتی تھیں، پھر انسان قید ہوتے تھے اور وہ قید ناختم ہونے والی غلامی میں تبدیل ہوجاتی تھی، مگر تاریخ انسانی گواہ ہے کہ محمد رسول اللہؐ کی آمد نے رفتہ رفتہ غلامی کو ختم کردیا، قیدیوں کی رہائی اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی مثال قائم فرمادی۔

سلام اسؐ پر جو دنیا کے لیے رحمت ہی رحمت ہے
سلام اسؐ پر کہ جس کی ذات فخرِ آدمیت ہے
سلام اسؐ پر کہ جس نے جھولیاں بھر دیں فقیروں کی
سلام اسؐ پر کہ مشکیں کھول دیں جس نے اسیروں کی

یوں تو نبی اکرمؐ کے احسانات کو کون شمار کرسکتا ہے، مگر آپؐ کا یہ اخلاق اور آپؐ کا یہ جذبہ۔

سلام اسؐ پر کہ جس نے فضل کے موتی بکھیرے ہیں
سلام اسؐ پر بروں کو جس نے فرمایا کہ میرے ہیں

معجزات کا تذکرہ ماہر صاحب اس اچھوتے انداز سے کرکے گذر گئے ہیں۔

سلام اسؐ پر کہ جس کی چاند تاروں نے گواہی دی
سلام اسؐ پر کہ جس کی سنگ پاروں نے گواہی دی

نبیؐ کی حیات طیبہ کے متعدد پہلو ہیں، آپ کی زندگی میں زہد وقناعت، عبادت وریاضت، تقویٰ وللّٰہیت ہی نہیں ہے، بلکہ آپؐ ایک قاضی وحاکم بھی تھے، سیاست سے بھی آپ کا واسطہ تھا، حکومت کی باگ ڈور بھی آپ سنبھالتے تھے، جنگوں میں قیادت بھی آپ نے فرمائی ہے، آپ کی سیرت اسی جامعیت کا تو درس دیتی ہے، قائد اگر مصیبت میں آگے نہ رہ سکے، میدان جنگ میں نہ آسکے، فیصلے نہ لے سکے، سردی وگرمی نہ جھیل سکے، زندگی کی نوکیلی شاہراہوں پر نہ چل سکے، آزمائش کے وقت دُبک کر بیٹھ رہے تو کیوں کر قیادت کا فریضہ انجام دے سکتا ہے، نبی کریم بذات خود میدان جنگ میں قیادت فرماتے تھے، میدان جنگ کا جائزہ لیتے تھے، صحابہ سے مشورے کرتے تھے، صف بندی فرماتے تھے، جنگی مہارتوں اور ضرورتوں کا خیال فرماتے تھے، آپؐ نے اس امت کے لیے خون پسینہ ایک کرنے کا نمونہ پیش کیا ہے، ہم فتح و شکست کے تذکرے تو کرتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ نبیؐ نے ہجرت کی مشقت برداشت کی، بدر کے میدان میں جب سب پر نیند طاری تھی تو نبیؐ فتح وکامرانی کے لیے اپنے خدا کی بارگاہ میں مناجات کررہے تھے، احد میں خون بہا رہے تھے اور خندق میں پیٹ پر پتھر باندھ کر کدال چلا رہے تھے، نبیؐ نے اپنی بے پناہ تگ ودو، عملی کوششوں اور بے پناہ محنتوں کے بعد زندگی کے راز ہائے سربستہ سے پردے اٹھائے، ماہر صاحب فرماتے ہیں۔

سلام اسؐ پر شکستیں جس نے دیں باطل کی فوجوں کو
سلام اسؐ پر کہ ساکن کردیا طوفاں کی موجوں کو
سلام اسؐ پر کہ جس نے زندگی کا راز سمجھایا
سلام اسؐ پر کہ جو خود بدر کے میدان میں آیا

نبیؐ نے رومن امپائر اور پرشین امپائر کے بارے میں جو پیشین گوئیاں فرمائی تھیں ان کو ذہن میں رکھیے مسلمانوں کی فتوحات اور ان کے عدل وانصاف بالخصوص فاتحین اولین کے جذبۂ ایمانی اور اتباع رسول کے حیرت انگریز واقعات پر نظر ڈالیے اور پھر تسلسل کے ساتھ یا صدی بہ صدی مخلص فاتحین کی کوششوں کا جائزہ لیجئے پھر ماہر صاحب کا یہ کلام پڑھیے تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ وہ یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ فتح و کامرانی اور عزت وحکمرانی کا واحد ذریعہ ہے کہ رسول اللہؐ کے

اتباع کو حرزِ جاں بنالیا جائے، یہی وہ کیمیا ہے جو شکست و نکبت کو عزت و عظمت میں تبدیل کرسکتی ہے، اسی کے اثر سے وہ طاقت پیدا ہوتی ہے جس کے سامنے بڑی بڑی طاقتوں کا ٹک پانا مشکل ہوتا ہے، اسی کے نتیجہ میں مادی اعتبار سے کمزور بے کس بھی تاریخ رقم کرجاتے ہیں، نبی سے محبت اور نبیؐ کے اتباع کے بعد ہی اس کا راز سمجھ میں آتا ہے ولا تهنوا فی ابتغاء القوم إن تكونوا تألمون فإنهم يألمون كما تألمون و ترجون من الله مالا يرجون وكان الله عليما حكيما (نساء) ''دشمنوں کے تعاقب میں کمزوری اور بزدلی مت دکھانا، اگر تمہیں تکلیف ہوتی ہے تو دشمنوں کو بھی تمہاری طرح تکلیف ہوتی ہے، لیکن تم اللہ کے جس ثواب کے امیدوار ہو وہ (اس کے امیدوار) نہیں ہیں، اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے اور حکمت والا ہے''، مسلمانوں نے ہر دور میں اس کا تجربہ و مشاہدہ کیا ہے مگر آج یہی جذبہ و کیفیت مفقود ہے تو یہ قوم لقمۂ تر بنی جارہی ہے اور دشمن کے در پر جبہ سائی میں اپنی عزت سمجھ رہی ہے، ماہر صاحب فرماتے ہیں ؎

سلام اسؐ پر کہ جس کا نام لے کر اس کے شیدائی
الٹ دیتے ہیں تخت قیصریت، اوج دارائی

دوسرے مصرع پر غور کیجئے کس مہارت کے ساتھ نہ صرف قیصر و کسریٰ کی شکست کی تاریخ بیان کی ہے بلکہ ''قیصریت'' اور ''اوج دارائی'' کے استعمال سے اس پوری سوچ، تہذیب اور تاریخ پر اسلام کی فتح اور اس کے ذریعہ آنے والی تبدیلی کو بیان کردیا ہے، آگے تاریخ کا نقشہ کھینچتے ہوئے اشارہ کرتے ہیں ؎

سلام اس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں
سلام اس پر جس کے پریشاں حال دیوانے
سنا سکتے ہیں اب بھی خالد و حیدر کے افسانے

اس کے آگے اشعار میں سیرت کی جامعیت کے اظہار کے ساتھ، شاعر کی وارفتگی، جذبات کی فراوانی اور زبان و بیان کی حلاوت کا ذخیرہ ہے، پڑھیے اور ان کی تاثیر سے دل و دماغ کو منور و معطر کرتے جایئے ؎

درود اسؐ پر کہ جس کی بزم میں قسمت نہیں سوتی
درود اسؐ پر کہ جس کے ذکر سے سیری نہیں ہوتی
درود اسؐ پر کہ جس کے تذکرے ہیں پاکبازوں میں
درود اسؐ پر کہ جس کا نام لیتے ہیں نمازوں میں
درود اسؐ پر جسے شمعِ شبستانِ ازل کہیے
درود اسؐ پر ابد کی بزم کا جس کو کنول کہیے
درود اسؐ پر بہارِ گلشنِ عالم جسے کہیے
درود اسؐ پر فخرِ بنی آدم جسے کہیے
رسولِ مجتبیٰ کہیے محمد مصطفیٰ کہیے
وہ جس کو ہادیٔ دع ماکدر خذ ما صفا کہیے
درود اس پر کہ جو ماہر کی امیدوں کا ملجا ہے
درود اس پر کہ جس کا دونوں عالم میں سہارا ہے

یا أیها الذین اٰمنوا صلوا علیه وسلموا تسلیما کی تشریح میں اس جامع سلام کے خوبصورت نعتیہ اشعار مکمل ہوئے، جس کا بیشتر بیانیہ سیرت کے نمونوں، اخلاق کریمانہ اور دروس پر مشتمل ہے، یہ مصرع تو اس قدر معنی خیز ہے بلکہ شاید نعتیہ شاعری میں نادر ہے کہ ''وہ جس کو ہادی دع ماکدر خذ ما صفا کہیے''، اس میں شاعر نے حضور اکرمؐ کی بعثت کے پورے مقصد اور بشریت کی ہدایت کے منہج کو گویا ایک مصرع میں سمیٹ دیا، اس شاہکار سلام کے بعد آئندہ سطروں میں ہم ماہر صاحب کی نعتیہ شاعری سے کچھ اور منتخب اشعار پیش کریں گے جس سے یہ دعویٰ مزید مدلل ہوگا کہ وہ نعتیہ شاعری میں منفرد بیانیہ رکھتے تھے، اس کو تبلیغ و ترسیل کا ذریعہ بناتے تھے، اور اس کے ذریعہ ایک نمایاں انقلاب کی دعوت دیتے تھے۔ (جاری)

☆☆☆

❑ ذکر آزادی

آزادی کا ۷۴واں سال

ملک، اقلیتیں اور مسلمان کتنا آزاد؟ بنگلور تشدد کے تناظر میں ایک تجزیہ

شکیل رشید

مبارک ہو! آزادی کا 74واں سال شروع ہوگیا ہے 75 سال پورے ہونے میں ایک سال کم۔ یہ مدت ایک آزاد ملک، وہ بھی بھارت جیسے جمہوری اور سیکولر ملک کے لیے، اپنے قدموں پر مضبوطی کے ساتھ کھڑا ہونے، ملک میں انصاف کے حصول کو ممکن بنانے، قانون کی بالادستی قائم کرنے، اور ملک بھر کے لوگوں میں، بلالحاظ مذہب اور ذات پات، احساس تحفظ کو تقویت دینے کے لیے کافی ہے۔ لیکن بھارت میں یقیناً بہت سارے ایسے لوگ بھی ہوں گے جو رات میں عدم تحفظ کے احساس کو ایک چادر کی طرح اوڑھ کر سوئے ہوں گے اور 15 اگست کی صبح اسی احساس کے ساتھ پھر جاگے ہوں گے۔ بھلا کیوں آزادی کے اتنے برسوں کے بعد بھی بہت سارے لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کا خوف سمایا ہوا ہے اور بھارت کی جمہوری اور سیکولر بنیادیں کمزور اور قانون کا سارا نظام، سارا لاء اینڈ آرڈر اور قانون نافذ کرنے والی ساری ایجنسیاں تقریباً غیر جمہوری اور غیر سیکولر بنیادوں پر چل رہی ہیں؟ اس سوال کا ایک جواب بنگلور کے تشدد میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس تشدد پر بات کرنے سے قبل گزرے ہوئے 73 سالوں پر اگر ایک نظر ڈال لی جائے تو مذکورہ سوال کا جواب تلاش کرنے میں مزید آسانی ہوسکتی ہے۔

آزادی کے بعد تقسیم اور قیام پاکستان کا عمل ملک کی تاریخ میں ایک زخم کی طرح شاید ہمیشہ تروتازہ رہے گا، اس لیے نہیں کہ یہ زخم بھرا نہیں جا سکتا، بلکہ اس لیے کہ کچھ لوگ اس زخم کو بھرنے دینا ہی نہیں چاہتے۔ بٹوارہ سے بہت سارے لوگوں کو مسلمانوں پر انگلیاں اٹھانے اور اسی بہانے اپنے مفادات- سیاسی، تہذیبی اور مذہبی- حاصل کرنے کا موقع مل گیا ہے آزادی کے ابتدائی سالوں میں مسلمان ایک طرح کے احساس شرمندگی کا شکار تھا اور کیوں نہ ہوتا کہ بٹوارے کا سارا الزام اسی کے سر دھر دیا گیا تھا، آزادی کے لیے اس کی ساری قربانیاں فراموش کر دی گئی تھیں، محمد علی جناح مسلمان تھے اس لیے ان کا عمل سارے مسلمانوں کا عمل قرار پایا تھا، ان مسلمانوں کا بھی جو بھارت چھوڑنے کو تیار نہیں ہوئے تھے، بٹوارے کے فسادات نے لوگوں سے بہت کچھ چھین لیا تھا، محبت کی جگہ نفرت نے لے لی تھی۔ لیکن اس

وقت کی سیاسی اور مذہبی قیادت آج جیسی مطلبی نہیں تھی بلکہ مخلص تھی۔ اس قیادت نے حوصلے بڑھائے اور نئے سرے سے زندگی گزارنے کی امنگ پیدا کی۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں نے بھارت میں اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی کامیاب کوشش کی اور سیاست، تعلیم اور تجارت تینوں ہی میدانوں میں کامیاب رہے اور اپنی کامیابیوں سے ملک کو ترقی کی راہ پر آگے بھی بڑھایا۔ مگر جب قیادت بدلی اور سیاست میں فرقہ پرستی کچھ یوں در آئی کہ سیکولر سیاست داں بھی اقتدار کے حصول کے لیے مذہب اور ذات پات کا کھیل کھیلنے کو درست سمجھنے لگے، فرقہ وارانہ فسادات عام ہوگیے اور مسلم قیادت مایا جال میں پھنس گئی تب سیاست، تعلیم وتجارت ان تینوں ہی میدانوں میں مسلمانوں کو ناکامیاں ملنے لگیں۔ لیکن اس کا ایک سبب کچھ ان کی نااہلی اور حالات کو نا سمجھنے کی روش بھی تھی اور کچھ مسلم قیادت کا اپنے سیاسی آقاؤں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے قوم کو نظر انداز کرنے کا چلن بھی۔ میرا اپنا یہ ماننا ہے کہ بھارت کو مضبوط جمہوری اور سیکولر بنیادوں پر کھڑا کرنے اور اقلیتوں میں، بشمول مسلم اقلیت، تحفظ کا احساس جگانے میں ناکامی کی سب سے بڑی مجرم سیکولر فورس یا بالفاظ دیگر سیکولر سیاسی جماعتیں اور ان جماعتوں میں شامل مسلم لیڈران ہیں، ان میں مذہبی لیڈران بھی شامل ہیں۔ آج بھارت کا مسلمان اپنے وجود کی لڑائی لڑنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ 1980ء کے بعد سے سیکولر قیادت نے اپنا چہرہ ایسا پھیرا ہے کہ سیکولر اور غیر سیکولر کا فرق ہی مٹ گیا ہے۔ بھلا یہ کون سی سیاست ہے کہ اقتدار میں رہنے کے لیے رام ولاس پاسوان، جارج فرنانڈیز، نتیش کمار، شرد یادو جیسے لوگ، جن کی زبانیں خود کو سیکولر کہتے نہیں تھکتیں، بی جے پی کو حکومت سازی میں مدد دیں! این ڈی اے کے سیکولر سٹوں نے فرقہ پرستی اور فرقہ پرستوں کو مضبوط کرنے کا ہی کام کیا ہے اور آج بھی یہی کام کر رہے ہیں، انہوں نے جمہوری اور سیکولر بھارت کو کمزور کیا ہے، اقلیتوں کے مسائل نظر انداز کیے بلکہ اقلیتوں کے مسائل کو پیچیدہ بنانے میں فرقہ پرستوں کا ساتھ دیا ہے۔ این آر سی، این پی آر کو ان سب کی حمایت حاصل رہی۔ ثبوت ان کی مدد سے سی اے اے کی منظوری ہے۔ کانگریس بھی اسی صف میں شامل ہے کہ اس نے بڑے ہی منظم انداز میں اقلیتوں بالخصوص مسلم اقلیت کی معاشی، تعلیمی اور سماجی کمر توڑنے کا کام کیا ہے۔ تعلیمی اداروں کے دروازے بند کرنا، سرکاری نوکریوں میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو جگہ دینا، بابری مسجد اور یکساں سول کوڈ جیسے مسائل زندہ رکھنا، اردو زبان کو اس کے جائز حق سے محروم رکھنا، اور سیاست میں مسلمانوں کو صرف ووٹ بینک کی طرح استعمال کرنا، کیا یہ کانگریسی قیادت کے وہ سیاہ کارنامے نہیں ہیں جو اس ملک کے مسلمانوں میں مایوسی کے پھیلنے اور ملک کو کمزور کرنے کا سبب بنے ہیں؟ جب مسلمانوں کو سیکولر سیاسی قیادت کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، ایودھیا آندولن کے وقت، جب سب کچھ کیا مذہب اور کیا وجود داؤ پر لگا تھا، جب فسادات کرائے اسی لیے جاتے تھے کہ مسلمان خوف کی نفسیات سے باہر نکل کر تجارت، تعلیم اور سیاست وغیرہ پر توجہ دے ہی نہ سکیں، تب جب سہارا مطلوب تھا بے سہارا کر دیا گیا تھا، اور آج تک مسلمان بے سہارا ہی ہیں۔ بھلا ان سیکولر سٹوں سے جو بابری مسجد کی جگہ تمام ثبوتوں کے باوجود بھی مندر کو دینے پر خاموش رہے بلکہ بھومی پوجن پر اڈوانی، اوما بھارتی اور آر ایس ایس کے سرسنگھ چالک موہن بھاگوت سے بھی زیادہ پرجوش اور

خوش تھے، کیا بھروسہ کیا جاسکتا ہے!

آج ملک ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہو گیا ہے جس کے دونوں ہی طرف کھائی ہے۔ اگر ایک جانب ملک سے سیکولر اور جمہوری آئین ختم کر کے بھارت کو ہندو راشٹر کی طرف تیزی کے ساتھ ڈھکیلنے والے بھگوا دھاری ہیں تو دوسری جانب سیکولرسٹوں کی وہ ٹولی ہے جو دھوکہ دیتی رہی ہے اور اب کھل کر، ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ دھوکہ دے رہی ہے۔ اس دوراہے پر کھڑا ہوا مسلمان یہ سوچ رہا ہے کہ کیا کیا جائے؟ کئی تجربے کیے جا چکے ہیں، کہا جاتا تھا کہ ایک بار اسے آزما لیا جائے جسے اب تک آزمایا نہیں گیا ہے، جب آزمایا تو وجود کے ساتھ مذہبی اور تہذیبی شناخت بھی داؤ پر لگ گئی۔ آج بی جے پی تقریباً سارے ملک پر چھائی ہوئی ہے، اسی لیے سنگھ پریوار کے سارے ایجنڈے لاگو ہو رہے ہیں۔ آر ایس ایس کے دوسرے سرسنگھ چالک گرو گولوالکر نے مسلمانوں کو، اور ان کے ساتھ عیسائیوں اور یہودیوں کو، بھارت کے اصلی باشندے کبھی نہیں قرار دیا تھا، یہی آر ایس ایس کا نظریہ اور فلسفہ ہے: بھارت ہندوؤں کے لیے۔ عیسائی اور یہودی تو محفوظ رہ سکتے ہیں کہ ان کے پیچھے سارا یوروپ اور امریکہ اور اسرائیل کھڑا ہوا ہے، لیکن مسلمان کہاں جائیں گے کہ مسلم دنیا تو خود فلسطینیوں کو تنہا چھوڑ کر اسرائیل سے دوستی کر رہی ہے۔ اکا دکا اٹھنے والی آوازیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ وزیر اعظم نریندر مودی کی حکومت کے دوسرے دور میں بڑی تیزی کے ساتھ سنگھ کے ایجنڈے پر عمل شروع ہو گیا ہے۔ آئینی ادارے حکومت کے اشارے پر آنکھیں بند کیے عمل پیرا ہیں۔ بابری مسجد کی جگہ، یہ ثابت ہونے کے باوجود کہ کسی مندر کی بنیاد پر مسجد کی تعمیر نہیں ہوئی ہے اور اس کی شہادت غیر قانونی تھی، رام مندر کی تعمیر کے لیے عدالت ہی نے سونپی ہے، اسی عدالت نے جس نے سینئر وکیل اکٹیوسٹ پرشانت بھوشن کی حق بیانی کے لیے انہیں توہین عدالت کا مجرم قرار دیا ہے، اس طرح سب کو تنبیہ دی ہے کہ آزادی اظہار رائے کا مطلب ہم جو نکالیں گے وہ ہوگا نہ کہ تم جو سوچو گے وہ۔ اب عام انسانوں کی زبان بندی کے دن قریب آگیے ہیں۔ بلکہ دن آہی گیے ہیں۔ اب بھلے یوگی آدتیہ ناتھ کی حکومت اور ان کی دیکھا دیکھی دوسری ریاستی سرکاریں حقوق انسانی کے رضا کاروں کو زندان میں ڈالتی رہیں، جمہوری اور آئینی احتجاج کے حق کا استعمال کرنے والوں کو ملزم مان کر ان کی املاک قرق کرتی رہیں، اور عدالت فریادیں نہ سنیں تو زبان پر حرف شکایت لانا آسان نہیں ہوگا کیونکہ یہ عمل عدلیہ کی توہین کا باعث قرار پا سکتا ہے۔ لوگ کہاں جائیں، کس سے فریاد کریں؟

ملک کو اس حالت میں پہنچانے کے جو ذمہ دار ہیں وہ کوئی جواب نہیں دیں گے۔ لوگوں کو خود ان سوالوں کے جواب تلاش کرنا ہوں گے۔ خیر ہم یہ تو جان گیے ہیں کہ ملک میں فرقہ پرستی کے عروج کی وجہ سیکولر قیادت کی دھوکہ دھڑی رہی ہے، اس میں مسلمانوں کی سیکولر کہلانے والی سیاسی جماعتوں سے جڑے سیاسی اور مذہبی قائدین بھی شامل ہیں، جی ہاں یہ بھی دھوکے باز ہیں۔

اگر ہم بنگلور کے تشدد پر نظر ڈالیں تو یہ سچ بہت ہی واضح ہو کر سامنے آتا ہے کہ کانگریسی ایم ایل اے اکھنڈا سری نواس مورتھی کے بھتیجے پی نوین کے ذریعے فیس بک پر پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ اور اماں حضرت عائشہؓ کی شان میں گستاخانہ پوسٹ کی خبر عام ہونے کے بعد جب

مسلمانوں میں غصے کی لہر دوڑی اور انہوں نے پولیس اور کانگریسی ایم ایل اے سے انصاف کی گہار لگائی تب پولیس ٹال مٹول سے کام لیتی رہی، پی نوین کو حراست میں لینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، مسلمانوں کے مجروح مذہبی جذبات کی تسکین کے لیے اقدامات کرنے میں پولیس ہچکچاتی رہی یہاں تک کہ رپورٹ بھی فوری طور پر درج کرنے کی بجائے یہ کوشش کرتی رہی کہ فریقین آپس میں بیٹھ کر معاملے کو نمٹا لیں۔ ایک سچ یہ بھی سامنے آیا ہے کہ جو بھیڑ جمع ہوئی اور بتدریج جس میں اضافہ ہوتا رہا اسے تتر بتر کرنے کے لیے پولس فورس کو آنے میں تقریباً دو گھنٹے کی تاخیر ہوئی۔ مذکورہ حقائق سے کئی سوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جیسے یہ کہ پی نوین کو فوری طور پر حراست میں کیوں نہیں لیا گیا؟ کیا کانگریسی رکن اسمبلی کا پولیس پر دباؤ تھا؟ پولیس کیا کسی کے اشارے پر پی نوین کے خلاف رپورٹ لکھنے سے ہچکچا رہی تھی؟ کیا پولیس فورس اس لیے جلد نہیں بھیجی گئی کہ بھیڑ بڑھتی رہے اور لوگوں کا غصہ تشدد میں بدل جائے؟ یہ بات بہت صاف ہے کہ اگر بھیڑ بڑھنے نہ دی جاتی اور فوراً رپورٹ لکھ کر پی نوین کے خلاف کارروائی شروع کردی جاتی تو تشدد نہ ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ بھیڑ میں شر پسند عناصر شامل کر دیے گیے ہوں، سیاسی حریفوں نے ایک دوسرے کو چت کرنے کے لیے تشدد پھیلا دیا ہو۔ کانگریس اور بی جے پی کی رسہ کشی کی خبر ہے۔ یہ بھی خبر ہے کہ ایس ڈی پی آئی کے مزمل پاشا اور مورتھی و پی نوین بھی ایک دوسرے کے سیاسی حریف ہیں۔ مسلمانوں کے جذبات کو جوش دے کر پہلے بھی سیاستدان سیاست کے توے پر روٹیاں سینکتے رہے ہیں۔ اور اب بھی سینک رہے ہیں۔ بنگلور کے ان ہی مسلمانوں نے جن پر تشدد کا الزام ہے انسانی زنجیر بنا کر مندر کی حفاظت کی اور پی نوین کی والدہ کو محفوظ مقام پر پہنچایا بھلا وہ کیسے اس قدر متشدد ہو گیے کہ ساٹھ سے زائد پولیس اہلکار زخمی ہو گیے اور رکن اسمبلی کے ساتھ پی نوین کے مکان میں توڑ پھوڑ اور آگ زنی ہوئی اور متعدد گاڑیاں پھونک دی گئیں؟ ان سوالوں کا جواب سامنے ہے، مسلمانوں کے غصے کو بھڑکنے دیا گیا، مسلم قیادت سوتی رہی، سوائے ایس ڈی پی آئی کے مزمل پاشا کے کوئی بھیڑ کو سنبھالنے والا نہیں تھا، سیکولر قیادت لاپتہ رہی اور پولیس کو کھلی چھوٹ دے دی گئی اس نے گولی باری کی، تین افراد شہید ہوئے دو سو سے زائد گرفتار اور مسلمانوں و دلتوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ پی نوین واضح رہے کہ دلت ہے۔ یہ آزادی کے 72 ویں سال میں وہ جمہوری اور سیکولر بھارت ہے جہاں اقلیتوں بالخصوص مسلم اقلیت کو سیاسی مفادات کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں گستاخی پر احتجاج بنیادی حق ہے لیکن اس حق کے مظاہرے کو تشدد میں تبدیل کر کے مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کر دیا جاتا ہے اور لوگوں کی ان سے نفرت مزید گہری کر دی جاتی ہے۔ مسلمان احتجاج کریں لیکن کسی کو تشدد پھیلانے کا موقع نہ دیں۔ نہ گولی کھائیں نہ جیل جائیں۔ اس کے لیے انہیں اپنی صفوں میں موجود شر پسند عناصر کو چھانٹنا ہوگا، فرقہ پرستوں کی سازشوں کو سمجھنا ہوگا اور اپنی صف میں جو مفاد پرست قائدین ہیں انہیں پہچان کر باہر کرنا ہوگا۔ ایک چیز اور ہے، اتحاد۔ جب تک مسلمان متحد نہیں ہوگا نئے بھارت میں رہنا اس کے لیے عذاب بنا رہے گا۔

☆☆☆